دفعدار عبدالبصیر سید عمران

₹ 10/-

PAGES 24

ایڈیٹر: زین شمسی

ہفت روزہ

مسلم دنیا
Muslim Duniya

GPO/LW/NP/-126/2017-2019 RNI NO. UPURD/2012/45277

Vol. No.: 6 | Issue NO.:22 | Friday, 24th Nov. to 30th Nov. 2017 | www.muslimsduniya.com | جمعہ 24 / نومبر تا 30 / نومبر 2017 | شمارہ نمبر:22 | جلد نمبر:6

URDU DUNIYA
تمام اخبارات ورسائل کا واحد مرکز
اردو دنیا
"اردو دنیا ہے ایک جہاں آباد"
سید عمران دفعدار عبدالبصیر
Syed Imran 8686989905 Dafedar A.Baseer 9985204027



ثقافت کا بہانہ
تاریخ پر نشانہ



ویڈیو میں تمہارا بھی چہرہ ہے، بتاؤ چوکی کس نے جلائی

ٹی وی والے بتاتے ہیں کہ کشمیری نوجوانوں کو پاکستان سے پیسے ملتے ہیں پتھر چلانے کے۔ ہندوستان کے لوگ کہتے ہیں کہ کشمیری غدار ہیں۔ فوجی بیچارے مجبور ہیں کہ پتھر کھانے کے باوجود وہ ان نوجوانوں پر گولی یا ڈنڈے نہیں چلا سکتے۔ اور کشمیری نوجوان نعرہ لگا رہے ہیں کہ انھیں 'آزادی چاہیے'۔ آخر ماجرا کیا ہے؟

کشمیر کا سچ
گراؤنڈ رپورٹ (قسط-3)



ڈاکٹر قمر تبریز

کشمیر کے اننت ناگ ضلع کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ڈمہال۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر غریب ہیں۔ کھیتی اور مزدوری کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔ گاؤں میں ایسے دو چار ہی لوگ ہیں، جن کے پاس سیب کے باغات ہیں۔ ظاہر ہے، اس سے ان کی اچھی آمدنی ہو جاتی ہے، لہٰذا انھیں خوشحال کہا جا سکتا ہے۔ اسی گاؤں میں غلام حسن شاہ نام کے ایک چھوٹے کسان رہتے ہیں۔ عمر ہے 57 سال۔ ان کے پاس تھوڑی سی زمین ہے، جس سے وہ اپنے گھر پر استعمال کے لیے سال بھر کا چاول پیدا کر لیتے ہیں۔ باقی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے دو گائیں پال رکھی ہیں۔ گائے کا دودھ بیچ کر وہ کچھ پیسہ کما لیتے ہیں، جس سے گھر میں دال سبزی اور صابن تیل کا انتظام ہوتا ہے۔

غلام حسن شاہ کے دو بیٹے ہیں۔ چھوٹا بیٹا مدثر شاہ 22 سال کا ہے۔ بارہویں پاس ہے۔ تندرست و توانا، اچھے ڈیل ڈول والا۔ پولس میں بھرتی ہونے کے لیے کئی بار کوشش کی۔ فزیکل ٹیسٹ تو پاس کر لیا لیکن انٹرویو میں اس لیے پاس نہیں ہو سکا، کیوں کہ رشوت دینے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ مدثر نے مجھ سے بتایا کہ کشمیر میں تقریباً تمام سرکاری محکموں میں رشوت خوری کھلے عام چلتی ہے۔ پولس میں بھرتی ہونے کے لیے اس سے 7 لاکھ روپے کی رشوت مانگی گئی۔ ظاہر ہے، ایک غریب کسان کا بیٹا اتنے پیسوں کا انتظام کہاں سے کرتا، اس لیے ابھی بھی بے روزگار گھوم رہا ہے۔ مدثر نے کئی بار آئی ٹی آئی کے لیے بھی فارم بھرے، لیکن ہر بار اس کا نام ویٹنگ لسٹ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر اس کا نام ویٹنگ لسٹ میں ہر بار کیوں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ کشمیر کے کسی آئی ٹی آئی کالج میں داخلہ لینے سے محروم رہ جاتا ہے۔ مدثر کو شک ہے کہ ہو سکتا ہے، یہاں بھی رشوت خوری چلتی ہو۔ ویسے، یہ بات سچ ہے کہ جموں و کشمیر میں رشوت خوری بڑے پیمانے پر چلتی ہے۔ آپ کسی بھی کشمیری سے پوچھ لیجیے، وہ اس کی تصدیق ضرور کرے گا۔ اسی طرح، جھوٹ بولنا کشمیر میں برا نہیں سمجھا جاتا۔ ہر بات پر اللہ کی قسم، خدا کی قسم اور قرآن پاک کی قسم کھانے والے کشمیری اتنی آسانی سے جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ کو شک تک نہیں ہوگا۔ حالانکہ، اسلام میں جھوٹ بولنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اسلام کا دم بھرنے والے اور پکے سچے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے کشمیریوں کو توبہ کرنی چاہیے۔

بہرحال، مدثر ایک دن صبح سویرے اپنے گھر سے چار کلومیٹر دور، اننت ناگ کے مشہور سیاحتی مقام اچھ بل میں اپنے ایک خریدار کو دودھ دینے کے لیے گھر سے نکلا۔ اس وقت سڑکوں پر زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ تبھی راستے میں کچھ فوجیوں نے مدثر کو پکڑ لیا، اپنی گاڑی میں بیٹھایا اور پاس کی ہی ایک فوجی چھاؤنی میں لے کر آ گئے۔ وہاں انھوں نے مدثر سے پوچھا کہ اس کے گاؤں میں گزشتہ دنوں جو پولس چوکی پھونکی گئی تھی، اس میں کون کون لوگ ملوث تھے۔ یہاں آپ کو بتاتا چلوں کہ پچھلے سال برہان وانی کو اسی اننت ناگ ضلع میں ایک انکاؤنٹر کے دوران مارا گیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً پورے کشمیر میں ملی ٹینٹوں نے سینکڑوں پولس چوکیوں اور فوجی چھاؤنیوں کو آگ کے حوالے کر دیا تھا۔ پولس اسٹیشن سے اسلحے لوٹ لیے تھے۔ بینکوں اور اے ٹی ایم کو لوٹا گیا تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس لوٹ مار میں ملی ٹینٹوں کا ساتھ سماج کے بگڑے ہوئے شرپسند نوجوانوں نے بھی دیا تھا۔ پولس چوکی سے لوٹے گئے اسلحے بعد میں گاؤں دیہات کے بزرگوں کے سمجھانے پر پولس کو بعض جگہ واپس بھی لوٹا دیے گئے تھے۔ ابھی کشمیر میں جتنے بھی ملی ٹینٹ سرگرم ہیں، ان کے پاس زیادہ تر اسلحے اسی لوٹ پاٹ سے حاصل کیے گئے ہیں۔

اننت ناگ ضلع کے ڈمہال گاؤں میں بھی ایک پولس چوکی کو پھونکی گئی تھی اور اسلحے لوٹے گئے تھے۔ بعد میں ان میں سے کچھ اسلحے، جو گاؤں والوں کے گھروں میں رکھے گئے تھے، اسے انھوں نے پولس کو لوٹا دیا تھا۔ لہٰذا، مدثر سے اس دن فوجی اسی بابت سوال کر رہے تھے۔ مدثر کا کہنا ہے کہ وہ اس واقعہ میں ملوث نہیں تھا، لیکن فوجیوں نے اسے چھاؤنی میں بری طرح مارنا شروع کیا۔ اس سے کہا کہ ان کے پاس ایک ویڈیو ہے، جس میں اس کا بھی چہرہ ہے۔ لیکن، مدثر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ان کے سامنے گڑگڑاتا رہا۔ فوجیوں نے اس کا شناختی کارڈ بھی چھین لیا اور ابھی تک نہیں لوٹایا ہے۔ کافی دیر تک اسے مارنے پیٹنے کے بعد فوجیوں نے مدثر سے پوچھا کہ دودھ لے کر کہاں جا رہے تھے۔ اس پر مدثر نے جواب دیا کہ اچھ بل میں آپ کی ہی فوج سے ریٹائرڈ ایک بزرگ ہیں، انھیں کے گھر جا رہا تھا دودھ لے کر۔ یہ سن کر ان فوجیوں کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ پھر اچانک مدثر کے تئیں ان کا رویہ پوری طرح بدل گیا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ منہ دھلوائے، اسے بسکٹ وغیرہ کھلایا اور بولے کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اس کے بعد یہ فوجی مدثر کو اپنی گاڑی میں بیٹھا کر اچھ بل چھوڑ گئے۔

پورے کشمیر میں ملی ٹینٹوں نے سینکڑوں پولس چوکیوں اور فوجی چھاؤنیوں کو آگ کے حوالے کر دیا تھا۔ پولس اسٹیشن سے اسلحے لوٹ لیے تھے۔ بینکوں اور اے ٹی ایم کو لوٹا گیا تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس لوٹ مار میں ملی ٹینٹوں کا ساتھ سماج کے بگڑے ہوئے شرپسند نوجوانوں نے بھی دیا تھا۔ پولس چوکی سے لوٹے گئے اسلحے بعد میں گاؤں دیہات کے بزرگوں کے سمجھانے پر پولس کو بعض جگہ واپس بھی لوٹا دیے گئے تھے۔ ابھی کشمیر میں جتنے بھی ملی ٹینٹ سرگرم ہیں، ان کے پاس زیادہ تر اسلحے اسی لوٹ پاٹ سے حاصل کیے گئے ہیں۔

مدثر ڈرا ہوا تھا۔ اس کو جہاں دودھ پہنچانا تھا، پہنچا دیا، لیکن وہاں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ واپس گھر پہنچ کر اپنے والد غلام حسن شاہ کو پورا واقعہ بتایا۔ انھیں کافی غصہ آیا۔ اگلے دن وہ ان فوجیوں کے پاس پہنچے اور بولے کہ لکھوں میں ان تمام لوگوں کے نام بتاتا ہوں، جنھوں نے پولس چوکی کو پھونکا تھا۔ جب انھوں نے پورے گاؤں والوں کا نام لکھوانا شروع کیا، تو فوجی بھی پریشان ہو گئے۔ غلام حسن شاہ نے مجھے بتایا کہ وہ کئی دنوں تک ان فوجیوں کے پاس چکر لگاتے رہے کہ وہ ان کے بیٹے کا شناختی کارڈ لوٹا دیں، لیکن انھوں نے نہیں لوٹایا۔ آخرکار، تھک ہار کر انھوں نے مدثر کا اب نیا شناختی کارڈ بنوا لیا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں، جو کشمیری نوجوانوں کو پتھر بازی پر اکساتے ہیں، جب کہ اصلی گنہگار آج کھلے عام کشمیر میں گھوم رہے ہیں اور بڑی بڑی وارداتوں کو انجام دے رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ساری غلطی فوج اور پولس کی ہی ہے۔ ہاں، اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ غلطی دونوں طرف سے ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے کشمیر کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کی سنجیدہ کوشش کسی بھی گوشے سے نہیں ہو رہی ہے، بلکہ صرف سیاست ہو رہی ہے۔

کشمیر میں مدثر جیسے ہزاروں نوجوان ہیں، جو فوج اور پولس کے ذریعہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ 16 جون کو صبح میں سرینگر کی ڈل جھیل میں 2-3 گھنٹے گزارنے کے بعد میں تقریباً 12 بجے اننت ناگ کے اچھ بل پہنچ چکا تھا۔ وہیں میں نے جمعہ کی نماز ادا کی اور شام کو جب وہاں سارے لوگ افطاری کی تیاری کر رہے تھے، تبھی شام 7 بجے اچانک گولیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہی پتہ چلا کہ وہاں سے دو کلومیٹر دور، کولگڑھ کے مقام پر ملی ٹینٹوں نے اچھ بل کے ایس ایچ او کی ٹیم پر حملہ کر دیا ہے۔ آناً فاناً میں ساری دکانیں بند ہو گئیں، سڑکیں اور بازار خالی ہو گئے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگے، اس خوف سے کہ کچھ ہی دیر میں فوج کا سرچ آپریشن شروع ہو جائے گا۔ اسی خوف کے عالم میں ہم سب نے افطار کیا۔ مغرب کے بعد پتہ چلا کہ کولگڑھ میں ملی ٹینٹوں کے حملے میں اچھ بل کے 35 سالہ ایس ایچ او فیروز احمد سمیت چھ پولس والے مارے گئے ہیں۔ اتنے بڑے حادثہ کو انجام دینے کے بعد ملی ٹینٹ وہاں سے فرار ہونے میں بھی کامیاب رہے۔ کئی دنوں بعد جا کر پتہ چلا کہ اس حملے کا گنہگار بشیر لشکری کسی دوسری جگہ سیکورٹی فورسز کی کارروائی میں مارا گیا۔

اس واقعہ کے اگلے دن میں نے کئی لوگوں سے بات کی اور جاننا چاہا کہ پولس والے بھی تو کشمیری ہی ہیں، پھر کشمیری ملی ٹینٹ اپنے ہی بھائیوں کو کیوں مار رہے ہیں؟ کولگڑھ میں مارے گئے اچھ بل کے ایس ایچ او کے بارے میں وہاں کے زیادہ تر لوگوں کی رائے اچھی نہیں تھی۔ مقامی لوگوں نے ان کے خلاف جو الزامات لگائے، میں ان کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہاں، اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ملی ٹینٹ حملے میں فیروز احمد کے مارے جانے پر مقامی لوگوں کو بہت زیادہ افسوس نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ملی ٹینٹوں نے فیروز احمد کو تقریباً 10 دن پہلے ہی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ وہ ان کو نشانہ بنانے والے ہیں۔

حیرانی مجھے اس بات کی تھی کہ اننت ناگ شہر سے اچھ بل کو جانے والی سڑک پر دن کے اجالے میں ملی ٹینٹوں نے اتنے بڑے واقعہ کو انجام دیا۔ ان کی یہ کارروائی تقریباً دو گھنٹے تک چلتی رہی، پھر بھی اس پولس پارٹی کی مدد کے لیے اس وقت نہ تو کوئی دوسری پولس ٹیم پہنچی اور نہ ہی کوئی فوجی یا نیم فوجی دستہ۔ جب کہ اس وقت سب کو معلوم ہے کہ کشمیر کا اننت ناگ ضلع 'ہاٹ بیڈ' بنا ہوا ہے۔ وہاں تقریباً ہر روز کہیں نہ کہیں ملی ٹینٹوں اور سیکورٹی دستوں کے درمیان کوئی نہ کوئی بڑا حادثہ ضرور پیش آتا ہے۔ ابھی حال ہی میں اسی اننت ناگ ضلع میں امرناتھ یاتریوں کی ایک بس پر بھی حملہ کیا گیا، جس میں 7 یاتریوں کی ہلاکت اور متعدد دیگر کے زخمی ہونے کی خبر ملی اور اب پورے ملک میں اس کی مذمت ہو رہی ہے۔ ایسے میں سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ آج پورے کشمیر میں ملی ٹینٹ کیوں کھلے عام گھوم رہے ہیں، کون انھیں پناہ دے رہا ہے؟ کشمیریوں کے دل سے موت کا ڈر کیوں نکل چکا ہے اور فوجی کیوں سہمے ہوئے ہیں؟ سیاست کون کر رہا ہے؟

"جب ایک فوجی نے کہا، سنبھل کر جانا....."

پڑھیں اگلی قسط میں۔

(dr.qamartabrez@gmail.com)
موبائل: 9891686976

تبدیلی کو ترقی کا نام نہ دو



زین شمسی

سیاست غیر سنجیدہ ایشو کو پیچیدہ بنا کر سنجیدگی کے ساتھ سماج کو رنجیدہ کرنے کا ہنر جانتی ہے، مگر یہ مستحکم اور مثبت سیاست نہیں ہے۔ اتھل پتھل مچانا، وبال پیدا کرنا اور شور و ہنگامہ کے بعد خاموش کسی کونے میں بیٹھ جانا منفی سیاست کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ سیاست ایک طرف موقع کی تلاش کا نام ہے تو دوسری طرف اس کے استعمال کے لیے درست وقت کے انتظار کا نام بھی ہے۔ جس طرح سیاست کے نام پر کی گئی ہر کارروائی سیاست نہیں ہوتی اسی طرح سماج میں ہونے والی ہر سرگرمیوں کے تار کو سیاست سے منسلک کرنا بھی سیاست کا حصہ نہیں ہوتا۔ چونکہ ہمارے سماج کی ذہن سازی اس طرح کی گئی ہے کہ ایک کی آواز دوسرے کا احتجاج بن جاتا ہے، اس لیے حقوق کی لڑائی اور انصاف کی لڑائی بھی سیاست کی لڑائی کے زمرے میں آنے لگی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خارجی اور داخلی مسائل کے حل کے لیے ہوئے تصادم میں ہمیشہ جیت سیاست کی ہوتی ہے اور عوام کو شکست کا کاسہ ہاتھ لگتا ہے۔ جب تک سیاست ویژن کے لیے ہوتی رہی ترقی ہوتی رہی اور جیسے ہی سیاست میں نظریات کی لڑائی کا رواج شروع ہوا ترقی کی جگہ تبدیلی نے لے لی۔ اس لیے اب دنیا کے تمام ممالک میں تبدیلی کو ہی ترقی کا سرٹیفکٹ دیا جانے لگا ہے۔

تبدیلی کو ہم ترقی کبھی نہیں کہہ سکتے، خواہ وہ دیکھنے میں ترقی جیسی ہی کیوں نہ لگے۔

اس پس منظر میں جب ہم بھارت کے پیش منظر کو دیکھتے ہیں تو کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ بھارت میں ترقی کے دو ہی دور آئے ہیں، ایک تب جب دہلی سلطنت اور عہد مغلیہ کے بادشاہوں نے بھارت کو مستحکم سیاست کا تحفہ دیا اور متحدہ ہندوستان کے نظریہ کو مکمل کیا، ساتھ ہی اصلاحات اور منصوبہ بندی میں ایمانداری اور شفافیت سے کام لیا۔ اس وقت کی جی ڈی پی 16 فیصد تھی۔ دوسری طرف اسی دور حکومت میں سماج کا رویہ ہم آہنگی اور بھائی چارگی سے بھرا رہا۔ تاریخ دانوں نے نے جس طرح اس دور کو اپنے ریسرچ میں برتا، وہ ایک مثال ہے کہ اقلیتوں کی حکومت ہوتے ہوئے بھی نہ ہی اس وقت کوئی لو جہاد کا شوشہ چھوٹا، نہ ہی تبدیلی مذہب پر کوئی بات ہوئی اور نہ ہی دوسرے مذاہب کی دل آزاری کا ماحول بنایا گیا۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ہمیں تاریخ کے اوراق پلٹنے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں ہے کہ 1025 سے 1857 اور اس کے بعد تک اگر مسلم حکمرانوں نے زبردستی اپنے مذہب کو غیروں کے مذہب پر تھوپنا چاہا ہوتا تو آج ہندوستان میں غیر مسلموں کی تعداد 10 فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی اور دوسری طرف اگر معاشی یا کاروباری نظریہ سے ہی مسلم حکمرانوں نے تعصب کا اظہار کیا ہوتا تو آج ہندوؤں کے ہاتھوں میں صنعت اور کانکنی اور معیشت کا اتنا بڑا کاروبار نہیں ہوتا۔ یہ تھی اصلی ترقی کہ جو جس کام میں مہارت رکھتا وہ اسی کام کو لے کر آگے بڑھا اور اسے کسی بھی طرح کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ترقی کا دوسرا دور مشینوں کا دور لے کر آیا۔ جسے ٹکنالوجی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں دنیا تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور مشین کا استعمال کر کے یوروپ دنیا کے نقشے پر چھا گیا۔ برطانیہ نے اسی دور میں بالادستی قائم کی، اور اپنی کمپنی اور کاروبار کو بڑھانے کے لیے دوسرے ممالک کی طرف کوچ کیا۔ مشینیں اس کے پاس تھی، مگر مزدوروں کی کمی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھارت کی طرف متوجہ کیا۔ کاروباری شکل میں آئی ہوئی کمپنی بھارت کے حالات اور سماج کو سمجھ نہیں سکی جو مغلوں کے دور میں قائم ہوا تھا۔ اس نے غلامی کے طوق میں بھارتیوں کو جکڑنا شروع کیا۔ مزدوروں کی شکل میں اسے ہاتھ چاہیے تھا، جو اسے بھارت میں مل گیا تھا۔ برطانوی ہندوستان کا معاشی اور سماجی جائزہ لینے والے پاتے ہیں کہ ایک طرف بھارت کے عوام سڑکیں، پل، ریل اور فیکٹریاں تو دیکھ رہے تھے دوسری طرف انہیں اس بات کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ انگریز ترقی کے نام پر بھارت کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ یہاں کے ہی آدمیوں سے کام کرواتے ہیں اور سارا مال انگلینڈ بھجواتے تھے۔

جیسے جیسے بھارتیوں میں یہ رجحان پروان چڑھا کہ انگریز انہیں صرف غلام سمجھنے لگے ہیں، (مغلوں کے دور میں انہیں ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا) ان کے اندر کا غصہ بڑھتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلی شروع ہوئی جو 1947 میں بھارت کی آزادی کے ساتھ ختم ہوئی۔

آزادی انگریزوں سے تو مل گئی لیکن بھارت کو توڑ گئی، یعنی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلی نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور معاشرہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ آزادی کے بعد جو ہوا وہ ایک المیہ ہے، ایک تکلیف دہ تاریخ ہے لیکن ہندوستانی لیڈروں نے اپنی آزادی اور اس کے ہدف کو قائم رکھنے کے لیے جو لائحہ عمل بنایا تھا وہ اس پر خود قائم نہیں رہ سکے۔ 1947 سے 1960 تک تو بھارت کی سیاست اس سماجی نفرت کو ہی رفو کرنے میں ضائع ہو گئی جو انگریزوں نے بانٹو اور راج کرو کی بنیاد پر کھڑی کی تھی، اسی لیے نہرو، ابوالکلام، پٹیل اور دیگر لیڈروں نے بھارت کی ترقی کے لیے جو کام کیا اسے صرف ایک سماجی تبدیلی کہا جا سکتا ہے، سماج کو ایک ساتھ لانے اور نفرت کو بھلانے کے لیے وہ کبھی اکثریتوں کی بات سن رہے تھے تو کبھی اقلیتوں کو منا رہے تھے۔ اکانومی ریٹ اور ترقی کی شرح نمو نہ آگے بڑھی اور نہ پیچھے گئی، کیونکہ تعلیم، روزگار، صحت اور سیکورٹی سے زیادہ انہیں یہ ضروری لگا کہ سماج میں ہم آہنگی قائم رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم کے بعد سے فسادات کا جو سلسلہ چلا وہ کہیں نہیں کہیں کسی نہ کسی شکل میں پھوٹتا رہا۔ ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں میں فسادات ہوتے رہے، جس کا سلسلہ آج تک تھما نہیں ہے، بلکہ فساد جیسے سماجی گناہ کو سمجھنا چاہیے سیاست کا منفعت بخش کاروبار بن گیا، جس میں ہندوستان کی دیگر مشینریاں بھی شامل ہوتی گئیں۔ ووٹ کی سیاست نے فساد کو سماج کا ایک حصہ بنا دیا۔

اکیسویں صدی کے شروعات میں گجرات اور پھر اتر پردیش میں مظفر نگر فساد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معاشرہ کی ذہن سازی میں انگریزوں کے ظلم کو کم اور مسلم حکمرانوں کے منفی پروپیگنڈے کو زیادہ تیزی کے ساتھ سرعت کی گئی، اسی لیے آج کے سیاسی اور سماجی حالات میں جب ہم ترقی کی بات کرتے ہیں تو یہ ایک مفروضہ ثابت ہوتا ہے۔ انگریزوں کے میک ان انڈیا اور 'بانٹو اور راج کرو' کی پالیسی ایک بار پھر سماج کو اتھل پتھل کرتی نظر آتی ہے جہاں اورنگ زیب روڈ کا نام بدل دیا جاتا ہے اور لارڈ منٹو روڈ کی تجدید کاری ہوتی ہے۔ جہاں تاج محل نشانہ پر ہے اور انڈیا گیٹ پروقار ثقافت کا حصہ ہے۔ جہاں گائے سے لے کر رانی پدماوتی تک ماتا ہو رہی ہے اور چپراسی کی ویکنسی میں ڈیڑھ ہزار پی ایچ ڈی اسکالر روزگار تلاش کر رہے ہیں۔ جی ڈی پی کی یہ حالت ہے کہ خود سرکار کے پاس اس کی صحیح اطلاع نہیں ہے، ایک وزیر کا بیان دوسرے وزیر کے برعکس ہے۔





ظاہر ہے کہ ترقی کے نام پر جس طرح کی سماجی تبدیلی ہوئی ہے، وہ صرف ہندوستان کا خاصہ نہیں ہے۔ ہندوستان تو محض عالمی سیاست کا ایک مہرہ ہے۔ عالمی تناظر میں دہشت گردی کے عفریت پر ہونے والی سیاست اور مسلم ممالک کو حاشیہ پر لے جانے والی تدبیراتی کارگر ثابت ہوئی ہے کہ آج دنیا دو حصوں میں صاف صاف بٹ گئی ہے۔ بھارت پر بھی اس کا اثر ہوا ہے۔ جہاں دنیا بھر میں مسلمانوں کی بدنامی کا شور مچا رہے وہاں ہندوستان کے باشندے اپنے ارد گرد رہنے والے مسلمانوں پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں اور وہ بھی تب جب دہشت گردی کے نام پر کبھی بھی کسی بھی مسلم نوجوان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جایا جاتا ہو اور کمال حیرت ہے کہ 16-15 سال بعد یہ کہہ کر رہا کر دیا جاتا ہے کہ اس انسان کے خلاف کسی بھی طرح کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ ایک آدمی کی زندگی تباہ کرنے والے سسٹم سے وابستہ کسی آفیسر کو سزا تو دور، اس کی سرزنش تک نہیں کی جاتی۔ ایسے میں سماج کی تنگ نظری مسلمانوں کے تئیں بڑھتے رہنا عام بات ہے۔

سماجی تبدیلی کے جو ٹولس ہیں، ان میں سب سے بڑا رول میڈیا، یعنی ترسیل و ابلاغ کے ذرائع کا ہے۔ عوام تک وہی پہنچایا جائے جو ارباب اقتدار چاہتے ہیں تو میڈیا نے یہ کام بہ حسن وخوبی کیا۔ ڈیجیٹل اور سائبر میڈیا نے اگر گودی اور پیڈ میڈیا کی پول کھولنے کی کوشش کی تو اس پر ہزار ہا طرح کی پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ سوشل میڈیا نے اگر ایک طرف پروپیگنڈہ کا کام کیا تو دوسری طرف ان خبروں کو بھی سامنے لانے کی ذمہ داری نبھائی جو سرکاری میڈیا کے جوتے میں پھنس کر سسک رہی تھی۔ آزادی اظہار رائے کو زہر ہلاہل مانا گیا، کئی ایسے لوگوں کو سرعام گولی مار دی گئی جو سماجی توہمات اور سیاسی شعبدہ بازی کی قلعی کھولنے کے لیے سامنے آئے۔ ادب و تاریخ کے پنے بدلے جانے لگے، ثقافت پر نکیل کسی جانے لگی، فن وفنکار کی زندگی تنگ کی جانے لگی ہے، جس کی تازہ مثال 'پدماوتی' کا وبال ہے۔

ہندوستانی زندگی میں تفریح کا سب سے سستا ذریعہ سنیما ہے۔ فلموں سے لوگ اتنا زیادہ متاثر ہوتے ہیں کہ اس کے ڈائیلاگس اور اس کے کارنامے حقیقی زندگی میں بھی اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بیشتر لوگ جانتے ہیں کہ فلم صرف تفریح فراہم کرتی ہے، خواہ وہ تاریخی پس منظر میں بنائی جائے یا سیاسی و سماجی پس منظر میں۔ اس سے حقیقت کا کوئی لگاؤ نہیں تھا، یہاں تک کہ وہ حقیقی لگتی ہوں۔ ایک فلم پروڈیوسر صرف پیسہ کمانے کے لیے فلم بناتا ہے، ایک اداکار صرف پیسہ کمانے کے لیے اس میں کام کرتا ہے، ایک ڈائریکٹر صرف پیسہ کمانے کے لیے ہدایت کاری کرتا ہے۔ اس لیے فلموں کو صرف ایک فلم کی طرح ہی دیکھا جانا چاہیے۔ فلموں کے ذریعہ بھائی چارگی اور جھوٹ پر سچائی کی جیت کا درس دینا اخلاقی عمل ہے۔ اب جبکہ فلموں کو بھی سیاسی ٹارگیٹ پر لے لیا گیا ہے تو پروڈیوسر اور ڈائریکٹروں کی بھی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سینسر بورڈ بھی حکمرانوں کے سہارے فیصلے لینے لگے اور انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ منسٹری بھی ایسے ماحول پر سختی کے ساتھ وار کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلمی اداکاروں کو جان سے مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے اور پروڈیوسروں کو فلم کی نمائش کے لیے معافی نامہ تک لکھنا پڑ رہا ہے۔ تاہم اسے اِس کے حالات کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ کانگریس کے دور میں بھی کئی فلمیں پابند کی گئیں، 'آندھی' کو سیاسی نقطہ نظر سے پابند کیا گیا تھا، 'گرم ہوا' پر بھی سرکار سخت ہوئی تھی۔ گجرات فساد پر بننے والی فلم پرجانیہ کو گجرات سرکار نے بین کیا تو 'دنگل' اور 'کیا کول ہیں ہم' پر بھی انگلیاں اٹھیں۔ تاہم جس طرح پدماوتی کی مخالفت ہوئی ویسی کسی دوسری فلم کے ساتھ نہیں ہوا، وجہ صاف ہے کہ اس میں علاء الدین خلجی اور پدماوتی کے رومانس کی کہانی کہی گئی، اور اسے ہندو مسلمان کے نظریہ سے دیکھا گیا۔ آجکل ملک کے کئی شعبہ حیات میں گھر پہنچی نفرت فلموں میں بھی دکھائی پڑنے لگی۔ اگر ہندو مسلمان کے معاملہ پر ہنگامہ ہونا تھا تو بھنسالی کی باجی راؤ مستانی میں کیوں نہیں ہوا، کیا وہ ایک تاریخی کہانی تھی۔ جس طرح وہ ایک تصوراتی فلم تھی، اسی طرح پدماوتی بھی ایک تصوراتی کہانی ہے، جسے ملک محمد جائسی نے تخلیق کیا ہے، لیکن وہی جو پہلے کہہ چکا ہے کہ سیاست انتظار کرتی ہے مواد کا، مظاہرہ کا، ایشو کا، اور جیسے ہی وہ مل جاتا ہے وہ اپنا کام کر جاتی ہے۔

جتنا ہنگامہ پدماوتی پر ہوا، اتنا پیراڈائز پیپر پر ہونا چاہیے۔ کالا دھن پر ہونا چاہیے، جی ایس ٹی اور نوٹ بندی پر ہونا چاہیے، روزگار کے فقدان پر ہونا چاہیے، کسانوں کی ریلیوں پر ہونا چاہیے، تعلیم کی بہتری پر ہونا چاہیے، لیکن ایسا ممکن نہیں، کیونکہ یہ دور ترقی کا نہیں، تبدیلی کا ہے اور تبدیلی یقیناً ترقی نہیں ہوتی۔

○○○

السلام علیکم

کئی ایک کالس همیں روز آنه آرهے هیں اخبار وقت په کئ گروپس میں پوسٹ نهیں هورها هے۔۔۔ سارے هندوستان کے نمبرس کوترسیل کرنا صرف **ٹیلیگرام ایپ** هی واحد حل هے۔۔ واٹسس ایپ یا ٹیکسٹ میسیج کے بجاے آپ **ٹیلگرام ایپ** انسٹال کر کے همیں مسیج کریں۔۔۔ آپ تمام جدید اراکین کو **ٹیلگرام** کے استعمال کا طریقه ویڈیوس کے زریعه رهنمائ کی جائیگی۔۔۔ آج هی یه ایپ پلے اسٹور سے انسٹال کریں۔۔۔

روزانه صبح 6 بجے اخبار پوسٹ هوتے هیں

https://play.google.com/store/apps/details?id=org.telegram.plus

اردودنیا

تمام اخبارات ورسائل کا مرکز

JUST TYPE URDU SEND ON

TELEGRAM APP NO'S



SYED IMRAN 8686 989905

OR

DAFEDAR ABDUL BASEER



9985 204027













کیا مودی گجرات ہار سکتے ہیں...؟

مودی کے کردار میں ایک خاص صفت اور ہے۔ وہ جنگ ہارنے میں یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ آخری سانس تک جنگ لڑنے میں یقین رکھتے ہیں۔ گجرات نے مودی کو مودی بنایا۔ اس لئے بھلا وہ گجرات کی جنگ میں ایسی آسانی سے کیسے ہار تسلیم کر لے گیں۔ ان حالات میں مودی کو کچھ نا کچھ تو کرنا ضروری ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کی مار کے بعد 'مودی ماڈل' کا منتر اب کارگر ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ اب صرف ایک ہی حربہ بچا ہے اور وہ یہ ہے کہ خود ہندو ہردے سمراٹ' بنیں۔ لیکن اس کے لئے مسلم دشمنی کا سیلاب درکار ہے۔ اس لئے اب گجرات کا چناؤ ایک خطرناک مرحلے میں پہنچ چکا ہے۔ اپوزیشن اور ہارد ک پٹیل جیسوں کو اب اس مرحلے سے نپٹنے کے لئے کوئی حکمت عملی تیار رکھنی ہو گی۔ ورنہ گجرات کی بساط پھر مودی کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔

ظفر آغا

نریندر مودی ہندوستان کے ان چند خوش قسمت سیاستدانوں میں سے ہیں جو چناؤ ہارتے ہی نہیں ہیں۔ محض لالو پرساد یادو وہ واحد سیاست داں ہیں جنہوں نے پچھلے بہار اسمبلی چناؤ میں نتیش کمار سے ہاتھ ملا کر نریندر مودی کی چناوی بساط الٹ دی تھی۔ لیکن مودی نے جلد ہی نتیش کو توڑ کر لالو کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اپنی شکست کا بدلا لے لیا۔ تب ہی تو مودی سے چناوی جنگ لڑتے ہوئے تمام ہندوستانی سیاستداں گھبراتے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کہیئے کہ خود مودی کا قلعہ گجرات مودی کے ہاتھوں سے نکلتا نظر آنے لگا ہے۔

جی ہاں، گجرات میں فی الحال بی جے پی کے جو حالات ہیں ان سے بی جے پی کے لئے گجرات اسمبلی چناؤ کی بازی اگلے ماہ جیت پانا مشکل نظر آ رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نریندر مودی کا چناوی جادو ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ مودی کے پاس چناؤ جیتنے کے دو نسخے ہیں۔ اول، مودی وہ سیاسی کھلاڑی ہیں جو جذبات پر چناؤ جیتنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ہندو ذہنوں میں ایک مسلم دشمن کی شبیہ پیدا کر خود کو ہندو محافظ (ہندو انگ رکھشک) کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ 'مسلم دشمن' سے گھبرایا ہندو ایک متحد ووٹ بینک کی شکل میں مودی یعنی بی جے پی کو ووٹ ڈالتا ہے اور اس طرح مودی کے حریف منھ تکتے رہ جاتے ہیں اور مودی چناؤ جیت جاتے ہیں۔ مودی کا دوسرا چناوی حربہ ہے 'سپنے یعنی خواب دکھاؤ اور چناؤ جیتو'۔ مودی کی چناوی کمپین کا اہم عنصر ووٹر کو چکا چوند کر دینا ہے۔ وہ وکاس یعنی ترقی کے امین بن کر ابھرتے ہیں۔ مثلاً وہ اسمارٹ سٹی، بلیٹ ٹرین، ڈیجیٹل دنیا، سوچھ بھارت، اسٹارٹ اپ وغیرہ جیسے 21 ویں صدی کے 'کیچ جملوں' کا استعمال کر ترقی کے سپنوں کا ایک ایسا مایا جال بنتے ہیں کہ جو لوگوں اور خصوصاً جوانوں کے ذہن پر ایک اثر ڈالتا ہے۔ ان کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مودی ہی وہ آدمی ہے جو اس کی زندگی بدل سکتا ہے اور بس وہ مودی کو ووٹ دے دیتا ہے۔ اس حربے کو کارگر بنانے کے لئے مودی الیکٹرانک ٹیکنالوجی کا زبردست استعمال اس طرح کرتے ہیں جیسے اس کا استعمال ایک 'ایڈ کمپین' میں ہوتا ہے۔ ایسی کمپین لوگوں کو چکا چوند کر دیتی ہے اور مودی، ووٹر کو مسیحا نظر آنے لگتا ہے اور بس چناوی بازی مودی کی ہوتی ہے۔ لیکن اس بار کے گجرات چناؤ میں مودی کے چناوی حربوں کی دھار ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ مودی پچھلے پندرہ دونوں برسوں سے گجرات کے ہندوؤں کے 'ہندو ہردے سمراٹ' ہیں اور یہ کرشمہ مسلم دشمن کا ہوا کھڑا کر چل رہا تھا۔ گجراتی ہندو کو مسلمان دشمن تب ہی نظر آتا ہے جب کوئی گودھرا جیسا واقعہ یا پھر کوئی اکشر دھام جیسا دہشت گردی کا سانحہ پیش آئے۔ بس پھر مودی اپنی لفاظیوں سے نفرت اور ہندو خوف کا بازار گرم کر کے مسیحا بن جاتے ہیں۔ لیکن آج تک گجرات میں نہ کوئی نیا گودھرا ہوا اور نہ ہی کوئی اکشر دھام جیسا حادثہ ہوا ہے۔ یعنی ہندو ذہنوں میں فی الحال کوئی مسلم خوف نہیں ہے۔ جب تک مسلم خوف نہیں ہو گا تب تک متحد ہندو ووٹ بینک بننا تقریباً ممکن نہیں ہے۔ ابھی تک گجرات میں یہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس لئے مودی کا چناؤ جیتنے کا پہلا نسخہ کام نہیں کر رہا ہے۔ اب یا تو کوئی آئی ایس آئی ایس جیسی دہشت گرد تنظیم کوئی بڑا آپریشن کرے اور یکا یک فضا بدلے اور مسلم دشمنی کے نام پر مودی پھر 'ہندو ہردے سمراٹ' بن جائیں تب تو بات الگ ہے ورنہ گجرات کی بازی مودی کے ہاتھوں سے نکل سکتی ہے۔ مودی کے دوسرے چناوی نسخے یعنی 'ڈیولپمنٹ ماڈل' کی ساحری بھی اس بار نہیں چل رہی ہے۔ مودی کو ملک کا اقتدار سنبھالے تین برس ہوئے ہیں نہ تو کہیں کوئی اسمارٹ سٹی نظر آ رہی ہے اور نہ ہی کوئی بلیٹ ٹرین چل رہی ہے۔ بھارت سوچھ ہونے کے بجائے گندگی اور بیماریوں کا ویسے ہی شکار ہے جیسے صدیوں سے تھا' اسٹارٹ اپ' تو جانے دیجئے جو پرانی تجارتیں تھیں وہ بھی بند ہو رہی ہیں۔

نوٹ بندی اور جی ایس ٹی نے ملک کی معیشت کی کمر توڑ دی۔ نوجوان بے روزگاری کا شکار ہے۔ ترقی کے سپنے چکنا چور ہو گئے اور لوگوں کو مودی کی لفاظی صاف نظر آنے لگی۔ مصیبت یہ ہے کہ گجرات میں اب ہندو بطور ہندو نہیں بلکہ اپنی ذات کی نگاہ سے خود کو دیکھ اور سمجھ رہا ہے۔ پٹیلوں کو لگ رہا ہے کہ مودی کے راج میں نہ صرف گجرات کا اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل گیا بلکہ ان کے نوجوان بغیر روزگار سڑکوں پر آ گئے۔ تب ہی تو ہارد ک پٹیل پاٹیدار پٹیلوں کے لئے ریزرویشن مانگ رہا ہے اور پٹیلوں کا ہیرو ہے۔ اسی طرح الپیش کمار پسماندہ ہندوؤں کا ہیرو ہے ادھر جگنیش میوانی دلتوں کی لڑائی لڑ کر دلتوں کو ان کی ذات پر مودی کے خلاف اکٹھا کئے ہوئے ہے۔ یعنی گجراتی ہندو بطور ہندو نہیں بلکہ ذاتوں میں بٹ کر اپنے ذاتی مفاد میں ووٹ ڈالنے کی حکمت عملی بنائے ہوئے ہے۔ تب ہی تو گجرات میں اس بار راہل گاندھی کا ڈنکا بج رہا ہے، ابھی تک مودی کا شور نہیں اٹھ سکا ہے۔ پھر 'گجرات ماڈل' کی ہوا وہاں کے تاجروں نے نکال دی ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کی مار سے پریشان گجراتی تاجر مودی کے خلاف سڑکوں پر مورچہ نکال کر بی جے پی مخالف میں آگے آ گئے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مودی واقعی گجرات ہار جائیں گیں! اگر گجرات ہارے تو سمجھیے وہ 2019 میں ہندوستان بھی ہار جائیں گے۔ مودی چناؤ ضرور لڑتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ایک تانا شاہ ہیں خود پوری بی جے پی ان سے تنگ ہے۔ اگر گجرات گیا تو مودی کے لئے بی جے پی کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر مشکلیں بڑھ جائیں گیں اور مودی جلد ہی بادشاہ سے سپاہی نظر آئیں گیں۔ مودی کے کردار میں ایک صفت اور ہے۔ وہ جنگ ہارنے میں یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ آخری سانس تک جنگ لڑنے میں یقین رکھتے ہیں۔ گجرات نے مودی کو مودی بنایا۔ اس لئے بھلا وہ گجرات کی جنگ میں ایسی آسانی سے کیسے ہار تسلیم کر لے گیں۔ ان حالات میں مودی کو کچھ نا کچھ تو کرنا ضروری ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کی مار کے بعد 'مودی ماڈل' کا منتر اب کارگر ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ اب صرف ایک ہی حربہ بچا ہے اور وہ یہ ہے کہ خود ہندو ہردے سمراٹ بنیں۔ لیکن اس کے لئے مسلم دشمنی کا سیلاب درکار ہے۔ اس لئے اب گجرات کا چناؤ ایک خطرناک مرحلے میں پہنچ چکا ہے۔ اپوزیشن اور ہارد ک پٹیل جیسوں کو اب اس مرحلے سے نپٹنے کے لئے کوئی حکمت عملی تیار رکھنی ہو گی۔ ورنہ گجرات کی بساط پھر مودی کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔

(بشکریہ قومی آواز)

رام مندر - بابری مسجد کا پٹارا پھر کھولا گیا؟

شری شری روی شنکر کا مقصد رام مندر - بابری مسجد کا تنازعہ حل کرنا تو شاید نہیں تھا تو کیا مندر کے نام پر جذبات بھڑکانے کی کوشش ان کا مقصد تھا؟! اگر ایسا تھا تو یہ مشن پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔

ہے رام ابی بی جے پی پھر سے بھگوان رام کی پناہ میں ہے۔ شری شری لکھنؤ اور ایودھیا کے درمیان چکر لگا رہے ہیں۔ بلاشبہ شری شری کی رام مندر کے لئے اچانک جاگی اس محبت سے بی جے پی کو امید نظر آنے لگی ہے۔ یوگی آدتیہ ناتھ نے تو خود ہی دیوالی پر ایودھیا میں عظیم الشان تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ تو کیا بی جے پی بھگوان رام کو لوگوں کے سامنے لانے کے لئے بے چین ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا بی جے پی کسی مصیبت میں ہے جو بھگوان رام کو یاد کر رہی ہے۔ کیوں کہ کبیر نے بھی کہا تھا دکھ میں سمرن سب کریں، سکھ میں کرے نہ کوئے۔ حقیقت یہی ہے کہ بی جے پی اس وقت پریشانی میں ہے۔ ان کے خود ساختہ 'وکاس پرش' نریندر مودی کا جادو پھیکا پڑ چکا ہے۔ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کے غلط اثرات سے نہ صرف کام دھندے بیٹھ گئے ہیں بلکہ عام لوگوں کا صبر بھی جواب دے گیا ہے۔ اب دہلی بی جے پی کے جھانسے میں نہیں آنے والے۔ اس سال ستمبر کے بعد سے بی جے پی نے کوئی چناؤ نہیں جیتا ہے۔ گرگاؤں اور ناندیڑ کا میونسپل چناؤ ہو، جے این یو سے لے کر الہ آباد یونیورسٹی طلباء یونین کا چناؤ ہو، پنجاب میں لوک سبھا کا ضمنی چناؤ ہو یا پھر مدھیہ پردیش میں ضمنی چناؤ بی جے پی کو ہر جگہ منہ کی کھانی پڑی ہے۔ 'مودی میجک' کام نہیں کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں صرف بھگوان رام ہی ہندو حقوق کی سینہ محافظ بی جے پی کو بچا سکتے ہیں۔ آخر بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر تعمیر کا جھانسہ دے کر ہی تو بی جے پی 1991 میں اہم اپوزیشن پارٹی بنی تھی۔ اب خطرہ اتر پردیش اور گجرات دونوں جگہوں پر ہے۔ گجرات مودی کا اپنا علاقہ ہے۔ 2003 سے مودی لگاتار وہاں سے چناؤ جیتتے رہے ہیں۔ گجرات نے ہی مودی کو ایک معمولی کارکن سے قومی سطح کا رہنما اور آخر میں وزیر اعظم بنا دیا۔ لیکن بی جے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ گجرات اب اس کا گڑھ نہیں رہ گیا ہے۔ راہل گاندھی نے اس کا راستہ کاٹ دیا ہے۔ کانگریس کے سخت مخالفین بھی یہی کہتے نظر آ رہے ہیں کہ گجرات میں بی جے پی کو کانگریس سے سخت مقابلے کا سامنا ہے۔ اگر ذرا بھی گڑبڑی ہوتی ہے تو مودی کا دہلی کا قلعہ بھی ڈھہ سکتا ہے۔ یقینی طور پر مودی کو ذاتی طور پر پریشانی ہے اور پوری بھگوا بریگیڈ اس وقت مصیبت میں ہے۔ لیکن بی جے پی صرف گجرات کے حوالے سے ہی پریشان نہیں ہے۔ اس کے سامنے مصیبت تو اتر پردیش میں بھی ہے۔ بی جے پی کے لئے یہ اہم ترین ریاست ہے۔ یہیں سے لوک سبھا میں سب سے بڑی تعداد میں یعنی 80 اراکین پارلیمنٹ جاتے ہیں۔ موجودہ لوک سبھا میں بھی بی جے پی کے 70 اراکین پارلیمنٹ اتر پردیش سے ہیں۔ جبکہ اتحادیوں کو بھی ملا لیا جائے تو یہ تعداد 73 پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت بھگوان رام کی آبائی ریاست بلدیاتی انتخابات میں مصروف ہے۔ وہاں سے جو اشارے مل رہے ہیں ان کے مطابق بی جے پی کی حالت خستہ ہے۔ اگر نتائج بھی اشاروں کے مطابق ہی رہتے ہیں تو بی جے پی کے لئے شرمندگی کی اس سے بڑی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ایسے میں بی جے پی کے پاس کامیابی کا ایک ہی فارمولہ ہے اور وہ ہے لوگوں کے جذبات کو بھڑکانا۔ بی جے پی رام مندر کے نام پر برہمنوں اور پدماوتی کے بہانے ٹھاکروں یا راجپوتوں کو بھڑکانے میں لگی ہے۔ لگتا ہے کہ بی جے پی ان دونوں مدعوں سے اتر پردیش کے بلدیاتی اور گجرات اسمبلی انتخابات میں ہوا کا رخ اپنی طرف کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن اس بار بی جے پی اسکرپٹ ٹھیک سے تیار نہیں کر پائی اور اس میں خامی رہ گئی۔ ہندو جذبات کو بی جے پی کبھی کامیابی سے ہوا دے پاتی ہے جب مسلمان رام مندر تعمیر کی مخالفت میں کھل کر سامنے آئیں۔ لیکن اس بار ماحول 1990 جیسا نہیں ہے جب بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد آمنے سامنے ہوں۔ ایودھیا میں تنازعہ والی جگہ پر کیا تعمیر کیا جائے یہ معاملہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ مسلمان مسلسل یہ کہتے رہے ہیں کہ عدالت کا جو بھی فیصلہ ہوگا انہیں منظور ہوگا تو پھر رام مندر تعمیر کے مدعے کو بی جے پی ہندو غصے کو کس طرح بھنائے؟ ممکنہ طور پر اسی وجہ سے شری شری روی شنکر جس مشن پر اتر پردیش پہنچے ہیں وہ ناکام ہوتا نظر آ رہا ہے۔

(باقی صفحہ 22 پر)

رام جنم بھومی بابری مسجد تنازع

عہد وسطیٰ کی شہادت

ہربنس مکھیا

ابوالفضل ایودھیا کو رام چندرجی کا رہائشی شہر تو قرار دیتا ہے لیکن ان کی جائے ولادت کا تعین نہیں کرتا نہ ہی کسی ایسے مندر کا ذکر کرتا ہے جو اس جگہ بنایا گیا ہو۔ وہ بابری مسجد کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ یہ مقالہ اپنی خصوصی توجہ اس سوال پر مرکوز کرتا ہے کہ کیا اس عمارت کے نیچے جسے آج بابری مسجد کہتے ہیں رام چندرجی سے منسوب کوئی مندر تھا؟ اس بحث میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے ماخذ سے شہادتیں پیش کی گئی ہیں۔

حالیہ متنازعہ عمارت کی تعمیر کی ابتدائی شہادت وہ تین تین اشعار پر مشتمل دو فارسی قطعے ہیں جو اس عمارت میں نماز پڑھنے والے ہال کی بیرونی دیوار پر اور محراب کے قریب اندرونی دیوار پر کندہ ہیں۔ سب سے پہلے نظر آنے والے اشعار داخلی دروازے کی محراب پر لکھے ہوئے ہیں اور آسانی سے پڑھے نہیں جاسکتے۔ تاہم مسز اے۔ ایچ۔ بیوریج نے توزک بابری کے انگریزی ترجمے بعنوان بابر نامہ کے کئی ضمیموں میں سے ایک میں انہیں شامل کر دیا ہے۔ انھوں نے اشعار کا مطلب بھی بیان کیا ہے اور ان کی ادبی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن جیسا کہ وہ دوسرے اشعار کے قطعے میں کرتی ہیں وہ ان کے مکمل تراجم سے احتراز کر گئی ہیں۔

اشعار یہ ہیں:

بنام آنکہ دانا ست اکبر
کہ خالق جملہ عالم لا مکانی
درود مصطفےٰ بعد از ستائش
کہ سرور انبیاء دو جہانی
فسانہ در جہان بابر قلندر
کہ شد در گیتی کامرانی

اردو ترجمہ:

(اس) کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو دانا، عظیم اور خالق کون و مکان ہے (مگر) خود لامکان ہے۔ پیغمبر پر درود سلام جو تمام تعریفوں سے بالا ہے اور جو دونوں جہانوں اور انبیاء کے سردار ہیں۔ بابر قلندر کا افسانہ (جہاں سے) مشہور ہے جو کامیابی کی اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا۔

جیسا کہ مسز بیوریج نے مشاہدہ کیا یہ اشعار مکمل نہیں ہیں۔ تاہم انھوں نے خبردار کیا ہے کہ ان میں مزید معنی تلاش کرنا غلط ہوگا کیونکہ زبان اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔

دوسرے تین اشعار جو عمارت کی پچھلی دیوار پر ہیں رام سیتا اور لکشمن کے مجسموں کی تعصب کی بنا پر اب پڑھے نہیں جاسکتے۔ لیکن ایک دفعہ پھر مسز بیوریج ہماری مدد کرتی ہیں۔ انھوں نے فارسی اشعار کا متن اور انگریزی کا ترجمہ اپنی کتاب کے اسی ضمیمہ میں درج کر دیا ہے۔ فارسی اشعار اور ان کا (اردو) ترجمہ درج ذیل ہے۔

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش
بنائیست تا کاخ گردون ملاقی
بنا کرد این مہبط قدسیان
امیر سعادت نشان میر باقی
بود خیر باقی چو سالش بنائش
عیان شد کہ گفتم بود خیر باقی

اردو ترجمہ:

شاہ بابر کے حکم سے جس کے عدل کی بنا آسمانوں کو چھو رہی ہے۔ نیک بخت میر باقی نے فرشتوں کے اترنے کی یہ جگہ تعمیر کی۔ یہ کار خیر ہمیشہ سلامت رہے۔ "یہ کار خیر ہمیشہ سلامت رہے" سے اس کی بنیاد رکھنے کا سال برآمد ہوتا ہے۔

میر باقی خاص طور پر اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ عمارت وہ بابر کے حکم سے تعمیر کر رہا ہے جس کے لیے مسجد کی بجائے وہ زیادہ دل خوش کن "مہبط قدسیان" یعنی "فرشتوں کے اترنے کا مقام" کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ مسجد میں تو کوئی جمالیاتی خوبی نظر نہیں آتی مگر یہ ترکیب جس سے مراد خانہ خدا ہے گو خدا خود لا مکان ہے، میر کی شاعرانہ حس کی پوری عکاسی کرتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بابر عمارات کی نسبت وہ شاعر بہتر تھا۔ تاہم عمارت کی ساخت میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ مسجد ہی ہے جس کے تین گنبد ہیں اور محراب کا رخ مغرب کی طرف ہے۔ اور نمازیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ مصلے ہیں۔ مسجد کے مندرجہ بالا کتبوں سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ مسجد کی تعمیر ایسی جگہ پر ہوئی ہے جہاں پہلے ہی سے کوئی عمارت یا کوئی مندر موجود تھا۔ نہ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی مسلک سے وابستہ لوگوں کی نظر میں یہ جگہ مقدس تھی۔

> **بابر خود بھی اپنی توزک کے ایک ہی صفحے پر دو جگہ اپنے ایودھیا کے 1535ء میں دورے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے ایودھیا میں چند دن قیام کیا . . . تاکہ وہ اودھ (زمانہ وسطیٰ میں ایودھیا کا فارسی مترادف) کے معاملات کو نپٹا سکے۔ وہ انتہائی معمولی معمولی واقعات کو بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا جیسے کہ شکار جس کے لیے اس کے کارندے پہلے ہی قراولی کر چکے تھے لیکن وہ اس جگہ پر کسی رام مندر کا کوئی ذکر نہیں**

بابر خود بھی اپنی توزک کے ایک ہی صفحے پر دو جگہ اپنے ایودھیا کے 1535ء میں دورے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے ایودھیا میں چند دن قیام کیا...... تاکہ وہ اودھ (زمانہ وسطیٰ میں ایودھیا کا فارسی مترادف) کے معاملات کو نپٹا سکے۔ وہ انتہائی معمولی معمولی واقعات کو بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا جیسے کہ شکار جس کے لیے اس کے کارندے پہلے ہی قراولی کر چکے تھے لیکن وہ اس جگہ پر کسی رام مندر کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ حیرانی کا باعث نہیں کہ اس نے مندر کے گرانے اور اس کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ایسی کسی چیز کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق اس معاملے سے ہو۔

ہماری اگلی شہادت ابوالفضل کی آئین اکبری سے ہے جس کی تکمیل سولہویں صدی کے اواخر کے قریب ہوئی۔ ابوالفضل ایودھیا کو رام چندرجی کا رہائشی شہر تو قرار دیتا ہے لیکن ان کی جائے ولادت کا تعین نہیں کرتا نہ ہی کسی ایسے مندر کا ذکر کرتا ہے جو اس جگہ بنایا گیا ہو۔ وہ بابری مسجد کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے "ایودھیا ہندوستان کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ پرانے زمانے میں یہ قدیم شہر طول میں 148 اور عرض میں 36 کوس تھا۔ اس زمانے میں یہ مقدس ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ شہر کے مضافات میں ریت کو چھان کر سونا اکٹھا کیا جاتا تھا۔ یہ رام چندر کا رہائشی شہر تھا جن کی شخصیت میں روحانی عظمت اور شاہی منصب مجتمع تھے۔"

اگر بابر جو شہنشاہ تھا اور ابوالفضل جو مورخ تھا، مندر کی جگہ مسجد کی تعمیر کے بارے میں خاموش ہیں تو اس خاموشی میں وہ اکیلے ہی نہیں تھے۔ نہ ہی بابر کے کسی جانشین بشمول متعصب اورنگ زیب کے اس جگہ پر بابری مسجد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ خود اورنگ زیب نے کئی مندر جن میں کاشی اور متھرا کے مندر بھی شامل تھے گروا کر ان کی جگہ مسجدیں بنوائی تھیں۔ ہندوؤں کے لیے یہ مقام بہت مقدس ہوگا اور کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ صرف اسی بنا پر اس مقام پر مسجد کی تعمیر کاشی اور متھرا کے مندروں کے گرانے کے جواز کے علاوہ اورنگ زیب کے لیے بڑے اطمینان قلب کا باعث ہوتی۔ لیکن وہ بھی اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ نہ ہی مورخوں کی ایک لمبی قطار جو سب کے سب درباروں سے وابستہ تھے مندر کو گرا کر مسجد کے لیے جگہ فراہم کرنے کا ذکر تو کجا مسجد کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسجد میں ایسی کوئی اہمیت نہیں تھی جو کٹر مسلمانوں کی نظر میں ہوتی اگر یہ ایک انتہائی قدیم اور مقدس مندر کی جگہ پر تعمیر کی جاتی۔ دربار سے وابستہ ہر قسم کے مورخ موجود تھے جن میں اکبر کے دربار سے وابستہ چہار شنبے کی نمازوں کے پیش امام ملا عبدالقادر بدایونی جیسے متعصب مسلمان بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملا نے تین جلدوں پر مشتمل اپنی منتخب التواریخ اس بڑے دکھ سے لکھی جو اکبر اور ابوالفضل کے ہاتھوں اسلام کو نقصان پہنچانے پر وہ محسوس کر رہا تھا اور وہ پچھلی بادشاہیوں کی طرف بڑی ماضی پرستی سے دیکھتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اسلام کی شان و شوکت بڑی نمایاں تھی۔ کافروں کی مقدس جگہ پر مسجد کی تعمیر اسے باغ باغ کر دیتی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔

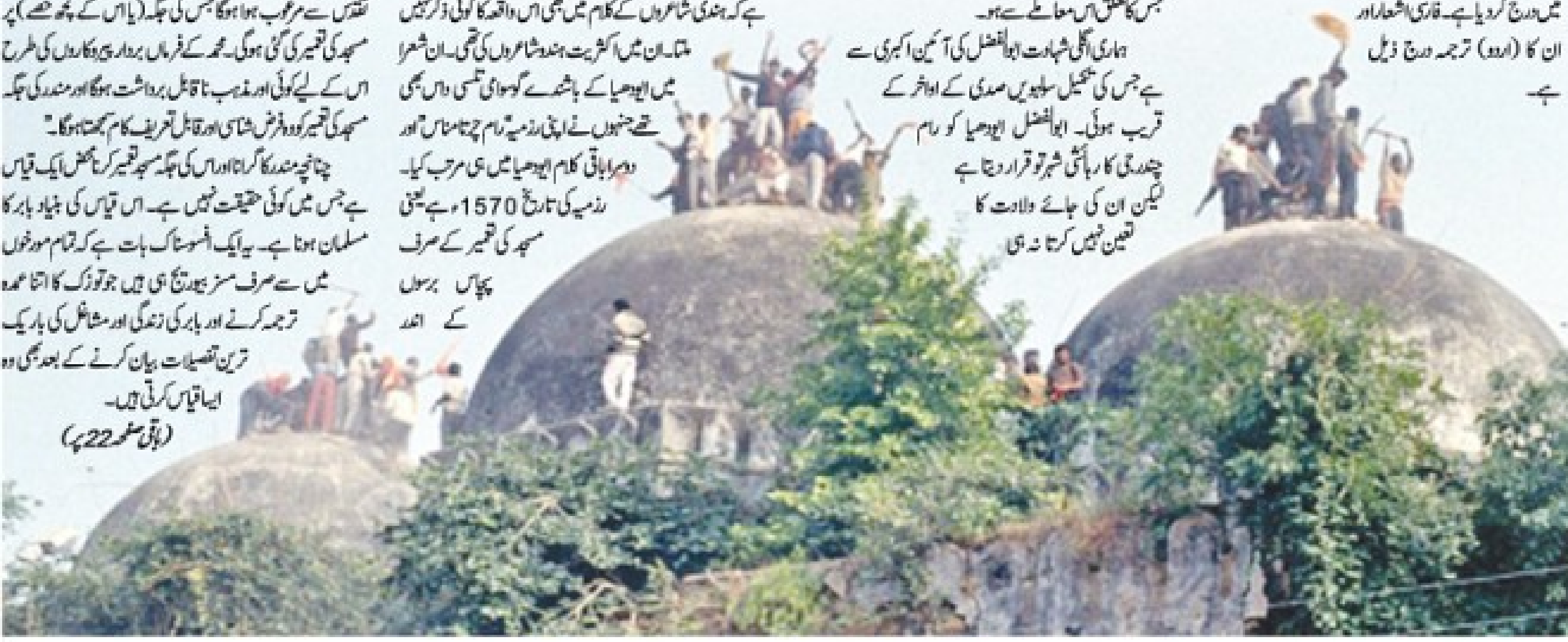
اگر یہ حیران کن ہے تو اس سے بھی زیادہ حیران کن یہ معاملہ ہے کہ ہندی شاعروں کے کلام میں بھی اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان میں اکثریت ہندو شاعروں کی تھی۔ ان شعرا میں ایودھیا کے باشندے گوسوامی تلسی داس بھی تھے جنھوں نے اپنی رزمیہ "رام چرتا مانس" اور دوسرا باقی کلام ایودھیا میں ہی مرتب کیا۔ رزمیہ کی تاریخ 1570ء ہے یعنی مسجد کی تعمیر کے صرف پچاس برسوں کے اندر اندر جو شاعر اور اس زمانے کے زندہ لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہونی چاہیے۔ رام چندر کے لیے عقیدت کے پیش نظر یہ واقعہ تلسی داس جی کو بالکل پاگل کر دیتا۔ لیکن وہ بھی اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔ حقیقت یہ کہ شاہی کتبے، درباری تواریخ اور دوسری دستاویزات ہر قسم کی ادبی کتابیں اور یورپی سیاحوں کی تحریریں بھی سب اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔

پہلی ناقابل تردید شہادت جو رام چندرجی کی جنم استھان پر مسجد کی تعمیر کا ذکر کرتی ہے وہ دستاویز ہے جو 1238ھ/1822ء میں داروغہ عدالت حفیظ اللہ نے فیض آباد کی عدالت میں پیش کی۔ مکمل قانونی زبان میں اس دستاویز کا متن کمال الدین حیدر اپنی کتاب قیصر التواریخ میں پیش کر چکے ہیں۔ ہم یہاں اس کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ "شہنشاہ بابر کی تعمیر کردہ جامع مسجد رام کے جنم استھان پر تعمیر کی گئی ہے یعنی وہ جگہ جہاں راجہ دسرتھ کا بیٹا رام پیدا ہوا تھا (اور جو) مذکورہ بالا رام کی بیوی سیتا کی رسوئی کی عمارت سے متصل ہے..... اس دستاویز سے مسجد اور رام جنم بھومی کے درمیان ربط شک و شبے سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ تاہم اس مقام پر کسی ایسے مندر کی موجودگی کا جسے گرا کر مسجد کی تعمیر کے لیے جگہ خالی کی گئی ہو یہ دستاویز کوئی ذکر نہیں کرتی۔"

انیسویں صدی کے باقی ماندہ حصے میں اس معاملے میں بڑی تیزی آئی اور اس تنازعے کی کچھ روایتوں میں مندر کو ایک مقام مل گیا۔ ایسے بہت سے تنازعے تھے لیکن تنازعہ کرنے والے سارے عدم تشدد کے پرستار نہیں تھے۔ تاہم 1860ء کی دہائی تک یہ روایت کمزور ہی رہی جس کی بنا پر پی۔ کارنیگی کو رام جنم بھومی پر مندر کی موجودگی کے متعلق قیاس آرائی کرنی پڑی۔ ان کے قیاس کی بنیاد وہ سیاہ ستون تھے جو مسجد میں نصب تھے لیکن انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ یہ ستون رام سے یا بدھ سے منسوب کس مندر کے ہیں اگرچہ دوسری جگہ وہ قطعی طور پر کہتے ہیں کہ مسجد نے پہلے سے موجود مندر کی جگہ لے لی اور تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا بیان "مقامی طور پر مصدقہ" اطلاع یعنی عوام میں مقبول روایت پر مبنی ہے۔ بیسویں صدی کی آمد پر یعنی 1905ء میں اس قصے نے فیض آباد کے ڈسٹرکٹ گزیٹیئر میں جگہ پالی اگرچہ ابھی بھی "ایک قدیم مندر" کے انہدام کا ذکر بڑا مبہم ہے۔ وہاں سے یہ قصہ مسز بیوریج نے اٹھا کر رام مندر کے گرائے جانے اور اس کی جگہ مسجد کی تعمیر کو ایک حتمی واقعہ بنا دیا۔ اسے ایک فیصلہ کن موڑ دینے کے لیے انہیں کسی شہادت کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف ایک مفروضہ درکار تھا یعنی مسلمان ہونے کی بنا پر بابر میں دوسرے مذاہب کے لیے کوئی برداشت نہیں ہوگی اور ایک ہندو عبادت گاہ کو مسجد میں تبدیل کر کے وہ اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوگا۔ اپنے اس ضمیمے کے حاشیے میں وہ اس خیال کا اظہار کرتی ہیں کہ "یہ مطلب ہے کہ ایودھیا میں اپنے قیام کے وقت مسجد کی تعمیر کا حکم بابر نے 934 ہجری میں دیا ہوگا جس کے دوران وہ قدیم عبادت گاہ کے وقار اور تقدس سے مرعوب ہوا ہوگا جس کی جگہ (یا اس کے کچھ حصے) پر مسجد کی تعمیر کی گئی ہوگی۔ محمد کے فرماں بردار پیروکاروں کی طرح اس کے لیے کوئی اور مذہب ناقابل برداشت ہوگا اور مندر کی جگہ مسجد کی تعمیر کو وہ فرض شناسی اور قابل تعریف کام سمجھتا ہوگا۔"

چنانچہ مندر کا گرانا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کرنا محض ایک قیاس ہے جس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس قیاس کی بنیاد بابر کا مسلمان ہونا ہے۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ تمام مورخوں میں سے صرف مسز بیوریج ہی ہیں جو توزک کا اتنا عمدہ ترجمہ کرنے اور بابر کی زندگی اور مشاغل کی باریک ترین تفصیلات بیان کرنے کے بعد بھی وہ ایسا قیاس کرتی ہیں۔

(باقی صفحہ 22 پر)







بی جے پی میں آئیے اور 'بھرشٹاچار مکت' ہو جائیے





ڈاکٹر سید احمد قادری

ایسا لگتا ہے کہ مرکز اور دیگر کئی ریاستوں میں برسر اقتدار بھارتیہ جنتا پارٹی کے لوگوں میں پورے ملک کی سیاست اور اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے جھوٹ پر جھوٹ بولنے کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حکومت میں شامل وزرا میں اس بات کو لے کر زبردست مقابلہ ہے کہ کون سب سے زیادہ جھوٹ بول کر ملک کے عوام کو بیوقوف بنا سکتا ہے۔

ایک طرف بی جے پی کے لوگ اس بات پر عوامی سطح پر فخر اور دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ ساڑھے تین سال کی مدت میں بھاجپا حکومت میں ایک بھی کرپشن کا معاملہ سامنے نہیں آیا۔ گزشتہ 16 ستمبر 17 کو جھارکھنڈ کے رانچی شہر میں بی جے پی کے قومی صدر امت شاہ نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ تین سال کی ان کی پارٹی کی حکومت میں حزب مخالف ایک بھی کرپشن کا الزام نہیں لگا سکی ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ بی جے پی کی موجودہ حکومت کا ہر قدم کرپشن ہی کی جانب اٹھتا ہے۔ چیخ چیخ کر ممبران پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں اور عوام سڑکوں پر اتر کر حکومت کے کرپشن اور ان سے ہونے والے قومی نقصانات پر احتجاج کر رہے ہیں۔ لیکن عوام کی آواز اور احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ لوگ ہٹلر کے پروپیگنڈہ وزیر جوزف گوئبلز کی اس بات پر پوری طرح عمل کر رہے ہیں کہ جھوٹ کو اتنی بار بولو کہ وہ سچ لگنے لگے۔ یوں تو بی جے پی میں جھوٹ بولنے کا مسلسل سلسلہ جاری ہے۔ لیکن جب بہت ہی ذمہ دار شخص بھی ایسے ہی جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، تو تعجب کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے کہ لوگ اقتدار حاصل کرنے کے لئے عوام کے درمیان اپنی اور اپنے ملک کی شبیہ کو کریہہ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں گزشتہ 1 نومبر کو ملک کے وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ نے ہماچل کے منڈی میں ایک عوامی جلسہ میں یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچائے کہ بدعنوان رہنماؤں کو اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ میں گزارش کرتا ہوں، تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے کہ اگر ان پر بدعنوانی کا الزام لگتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو جائیں۔ راجناتھ سنگھ نے ساتھ ہی ساتھ فخریہ یہ بھی کہا کہ ساڑھے تین سال کی مودی حکومت میں ایک بھی کسی وزیر پر بدعنوانی کا الزام نہیں لگا ہے۔

وزیر داخلہ کے اس بیان پر بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہتا ہے کہ جس پارٹی کی حکومت کے لوگ سر سے پیر تک بدعنوانیوں میں ڈوبے ہوئے ہوں، اس پارٹی کا ایک وزیر ایسی مضحکہ خیز بات کر رہا ہے۔ دوسری پارٹیوں کے افراد کے ذریعہ لگائے گئے الزامات کو چھوڑئیے، کہ ان کا کام اختلاف کرنا ہی ہے۔ لیکن خود ان کی ہی پارٹی کے صف اول کے رہنماؤں مثلاً یشونت سنہا، ارون شوری، کرتی آزاد، شتروگھن سنہا وغیرہ نے جس طرح کے کرپشن کے الزامات اپنے لیڈروں پر لگائے ہیں، کیا وہ بھی غلط ہیں؟ مختلف ممالک کے سروے رپورٹ بھی غلط ہیں؟ بی جے پی کے رہنما سابق ممبر پارلیامنٹ کرتی آزاد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مجھے پارٹی سے صرف اس وجہ کر برطرف کیا گیا کہ میں نے چور کو چور کہا اور کرپٹ وزیر ارون جیٹلی کے خلاف جانچ کا مطالبہ کیا تھا کہ جس شخص کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور جو سیکنڈ ہینڈ کار پر چلتا تھا، وہ آج پانچ سو کروڑ کا مالک کیسے بن گیا۔ اگر میں نے جانچ کا مطالبہ کیا تو کیا غلط کیا تھا کہ اس کی پاداش میں مجھے پارٹی سے برطرف کر دیا گیا۔ بی جے پی کے کئی بڑے لیڈروں کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر حکومت میں ساتھ رہنے والی شیو سینا کے سربراہ نے جس طرح بی جے پی کے کرپشن کو اجاگر کیا ہے، کیا یہ بھی غلط ہے؟ شیو سینا کے صدر دفتر سے تو باضابطہ بی جے پی کے ایکناتھ کھڈسے، سمیت دس کرپٹ لیڈروں کی تصاویر اور ان کی بدعنوانیوں کی تفصیل 56 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ "گھوٹالے باز بھاجپ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ شیو سینا نے کرپشن کے معاملے میں خود مودی اور امت شاہ کو نشانہ بنایا ہے۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں ختم ہوتا ہے، بلکہ جس انا ہزارے کے سہارے بی جے پی کی حکومت برسر اقتدار آئی، اسی انا ہزارے نے بھی بی جے پی حکومت کے مسلسل کرپشن کو دیکھ کر تنقید کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ بدعنوانیوں میں کانگریس نے گریجویشن کیا تھا، اب بھاجپا پی ایچ ڈی کرنے میں لگی ہے۔ World Economic Forum کی حالیہ ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دس سب سے کرپٹ لوگوں کی فہرست میں ساتویں نمبر پر مودی کا نام ہے۔

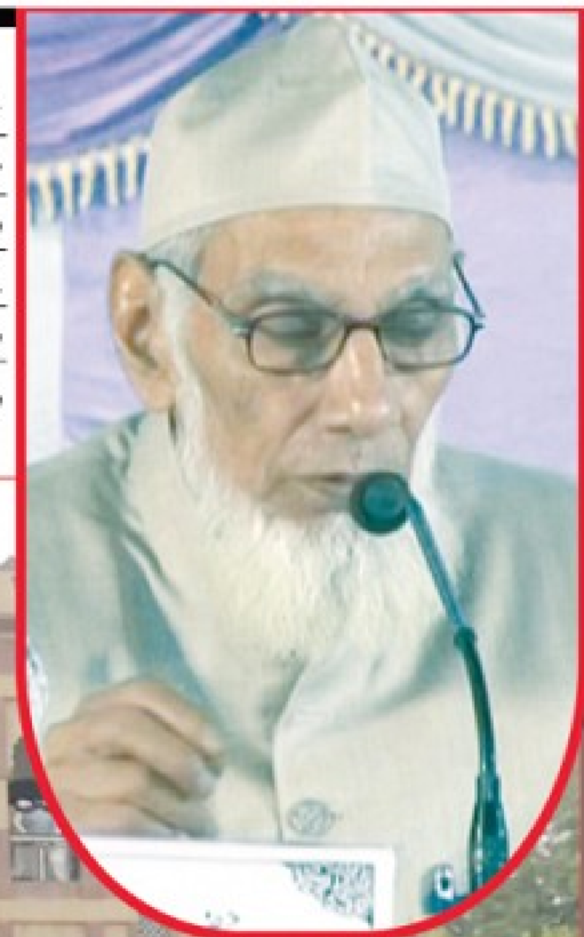
> **مغربی بنگال میں جب پارٹی کے قدم جمانے کی ہر کوشش بھاجپا کی ناکام ہوگئی تب، جس مکل رائے سمیت شاردا چٹ فنڈ اور نارد ا اسٹنگ کے سلسلے میں تیرہ لوگوں پر ایف آئی آر درج کی گئی تھی اور سی بی آئی کے پاس مکل رائے کے گھوٹالوں میں شامل ہونے کے ثبوت تھے۔ ان سی بی آئی اور ای ڈی نے نارد ا اسٹنگ جانچ کے سلسلے میں پوچھ تاچھ بھی کر چکی تھی، یوں کہا جائے کہ مکل رائے پوری طرح سی بی آئی کے شکنجے میں تھے اور بی جے پی انہیں بھرشٹ بتانے میں تھک نہیں رہی تھی۔ انہیں بھی سلاخوں کا خوف دلا کر بھاجپا کے مرکزی وزیر قانون نے قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایک جلسہ میں بھاجپا میں شامل کر، کمل کا پھول پیش کیا گیا۔**

میں بی جے پی کے ان کرپٹ لوگوں کی بہت لمبی فہرست کو اس وقت اپنے اس مضمون میں شامل نہیں کر رہا ہوں، جنھیں میں مختلف اوقات میں پیش کر چکا ہوں۔ میں امت شاہ کے بیٹے جے شاہ کے ذکر کو بھی چھوڑ رہا ہوں، جنھوں نے نہ صرف ملک کے اندر، بلکہ پوری دنیا کی تجارت میں سولہ ہزار فی صد منافع کما کر ایک مثال قائم کی ہے۔ انھیں تو اس بڑے اچیومنٹ کے لئے عالمی سطح پر ایوارڈ ملنا چاہئے۔ لیکن ہمارے سابق وزیر مالیات اور موجودہ بی جے پی کے لیڈر یشونت سنہا مسلسل اس بات پر مصر ہیں کی جے شاہ پر جب جانچ ہو سکتی ہے تو جے شاہ کے گھوٹالے کی جانچ کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔ اب انھیں کون بتائے کہ ارون شوری کے مطابق اس وقت مرکز میں ڈھائی شخص کی حکومت میں جے شاہ پورے ایک شخص کے شاہزادے ہیں، کس کی ہمت ہے کہ ان پر کسی طرح کی جانچ کی بات کہے۔ کرپشن سے شدید طور پر نفرت کرنے والے بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کو بی جے پی کے اعلیٰ کمان نے نہ جانے ایسی کون سی اہم بات بتائی کہ وہ 'زہر کا گھونٹ' پینے کے لئے تیار ہو گئے اور اچھی خاصی چل رہی حکومت کو اپنی تحویل سے نکال کر بی جے پی کے حوالے کر دیا اور اب مسلسل انھیں زہر کا گھونٹ پینا پڑ رہا ہے۔ یہاں تک کہ جس کرپشن کے سامنے آنے پر وہ لالو پرساد کے جنتا دل سے الگ ہو کر بی جے پی کے ساتھ حکومت بنائی، اس حکومت میں اے ڈی آر (Association for Democratic reforms) کی گزشتہ 2 اگست 17 کو جاری ایک رپورٹ کے مطابق 76% فی صد داغی وزرا شامل ہیں اور یہ رپورٹ بذات خود ان وزرا کی جانب سے اپنے انتخابی حلف نامے میں درج کی گئی تفصیلات پر مبنی ہے۔ اب نتیش جی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ جائیں تو جائیں کہاں، وہ تو اب بری طرح بدعنوان لوگوں کے درمیان گھر گئے ہیں۔

ابھی حال میں جرمنی کے جس اخبار نے پناما لیکس کو اجاگر کیا تھا، اسی اخبار نے پیراڈائز پیپرس کے معاملہ کو سامنے لا کر ایک طوفان مچا دیا ہے، یہاں تک کہ میڈیا کو اس سوال کا جواب دینے سے بچنے کے لئے پیراڈائز پیپرس میں شامل بھاجپا کے راجیہ سبھا ممبر رویندر کمار سنہا کو 'مون برت' رکھنا پڑا۔ بڑے پیمانے پر اجاگر ہونے والے ٹیکس بچانے والوں کی اس لمبی فہرست میں ایک مرکزی وزیر سمیت کل 714 لوگوں کا نام شامل ہے، اور جو ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب بڑے ہی نہیں، کافی بڑے اور بڑی پہنچ والے لوگ ہوں گے۔

مزید برآں، اب بی جے پی یہ بھی کر رہی ہے کہ جن ریاستوں میں جو کوئی بھی ووٹ اور نوٹ دلانے کی طاقت رکھتا ہے، خواہ وہ جس قدر بھی کرپشن کے کیچڑ میں ڈوبا ہوا ہو، اسے اس کیچڑ سے نکال کر اس کے ہاتھوں میں کمل کا پھول تھما کر 'بھرشٹاچار مکت' کر دیا جاتا ہے۔ کل تک ہماچل پردیش کے جس سابق کانگریسی مرکزی وزیر سکھ رام کو دکھ رام کہا جاتا تھا، ان کے کرپشن پر ملک بھر میں 1996ء میں بھاجپا نے زبردست احتجاج اور مظاہرے کئے تھے، اور جس سکھ رام کی رہائش گاہ سے تین کروڑ کی نقد رقم ایک چھاپے میں ملی تھی اور جو تہاڑ یاترا بھی کر آیا ہو، آج وہی سکھ رام بی جے پی کے لئے اچھوت نہیں رہا اور انھیں پارٹی میں شامل کر فخر محسوس کیا جا رہا ہے۔ بی جے پی کے لئے اب زمین گھوٹالہ اور مائنس گھوٹالہ میں ملوث پائے جانے پر وزیر اعلیٰ کی کرسی سے ہٹائے جانے والے کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ بی ایس یدیورپا کو بھی اب نہ صرف پارٹی میں شامل کر لیا گیا ہے، بلکہ انھیں کرناٹک کے اگلے وزیر اعلیٰ کی کرسی کی بھی پیش کش کر دی گئی ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال میں جب پارٹی کے قدم جمانے کی ہر کوشش بھاجپا کی ناکام ہوگئی تب، جس مکل رائے سمیت شاردا چٹ فنڈ اور نارد ا اسٹنگ کے سلسلے میں تیرہ لوگوں پر ایف آئی آر درج کی گئی تھی اور سی بی آئی کے پاس مکل رائے کے گھوٹالوں میں شامل ہونے کے ثبوت تھے۔ ان سی بی آئی اور ای ڈی نے نارد ا اسٹنگ جانچ کے سلسلے میں پوچھ تاچھ بھی کر چکی تھی، یوں کہا جائے کہ مکل رائے پوری طرح سی بی آئی کے شکنجے میں تھے

(باقی صفحہ 22 پر)



۱۹۶۰ء کے آس پاس آپ عملاً دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوگئے، مگر اس وقت ایک ملازم کی حیثیت ہی سے آپ متعارف تھے درس وتدریس اور صحافت وخطابت کے میدان میں شناخت کا کوئی عنصر نہیں تھا، لیکن ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم کی انتظامیہ نے جب اجلاس صد سالہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو مولانا حامد الانصاری غازی کے بعد اس کے لئے بنائے گئے عارضی دفتر کے قائم مقام نگراں مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی ہی تھے، وہاں آپ کی انتظامی صلاحیتوں کا راز کھلا، پھر جب دارالعلوم میں نئی انتظامیہ تشکیل پائی اور وقف دارالعلوم کے نام سے ایک دوسرے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تو مولانا محمد اسلم قاسمی کی خوابیدہ صلاحیتوں نے بھی انگڑائیاں لینی شروع کردیں۔



صاحبِ علم وقلم اور بلند پایہ خطیب

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی کا سانحۂ ارتحال

مفتی محمد ساجد کھجناوری

13 نومبر ۲۰۱۷ء کی دوپہر میں قافلۂ علم وکمال کی ایک ایسی بافیض اور دلنواز شخصیت نے آخرت کی راہ لے لی جن کی کتاب زندگی کا ہر ورق درخشاں اور فکر آگہی کا عنوان بتانے والا تھا۔ علم، ادب، دانش، کمال، ذہانت، ذکاوت اور شرافت وآدمیت جیسے عناصر کی ترکیب سے جنم لینے والی یہ عظیم ہستی حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی کی ذات والا صفات تھی، افسوس کہ اخلاق ومروت کی یہ مجسم تصویر بھی اب سدا کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون:

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

اس تیرہ خاکدان میں کتنے ہیں جو نام ور ہوکر بے نام ونشان ہوگئے اور کتنے ہیں جن کے گلستان حیات میں بہاریں رقص کناں ہیں، لیکن خلق خدا کی نفع رسانی نہ ان کے لئے مقدر اور نہ وہ اس خیرخواہانہ جذبہ کے روادار، نتیجتاً وہ اپنی من چاہی زندگی گزار کر اس طرح لقمۂ اجل بن جاتے ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ قرآن مقدس کا یہ حقیقت افروز بیان ذیل کی آیت میں نفع رسانی کے اسی خوبصورت جذبہ کا اظہار واعتراف ہے جو ہر مومن کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

"فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ بہرحال جھاگ تو وہ یونہی اڑ جایا کرتا ہے، اور جو چیز لوگوں کے لئے نفع بخش ہوتی ہے وہی دیر پا ہوتی ہے"۔

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی نے بھی امت کی اصلاح وتربیت اور اس کے نوجوانوں کو قال اللہ وقال الرسول کے زمزمے سنا کر ان نصیبہ وروں میں اپنا نام درج کرالیا جنہیں سعادت دارین کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ حضرت مولانا نے جن علمی راہوں کا انتخاب کیا وہ ان کا خاندانی اختصاص بھی تھا، آخر کون نہیں جانتا کہ برصغیر میں جب اسلام کو پسپا کرنے اور حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازشیں بروئے کار تھیں تو اسی صدیقی النسل اور یار غار سے نسبت پانے والے حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تحفظ شریعت اور بقائے دین کی خاطر قیام مدارس کا صور پھونک دیا تھا، انہوں نے اپنی مومنانہ فراست سے فرنگیوں کے مذموم مقاصد کو نہ صرف ناکام بنایا بلکہ مدت مدید تک اسلام کے قلعوں کو استحکام ودوام بخشنے کے اصول بھی بتا گئے، مولانا محمد اسلم کے شہرت پذیر والد گرامی اور دارالعلوم دیوبند کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے والے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب جن کے علم وکمال کی عظمتوں سے ہر کوئی آشنا ہے ایک قد آور سیدہ عالم دین اور طبقۂ علماء کی معلوم شخصیت تھے، مولانا محمد اسلم صاحب نے اسی عالم ربانی کے یہاں ۳۱ جون ۱۹۳۷ء میں آنکھیں کھولیں، آپ کی تعلیم وتربیت تا انتہا دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، جبکہ عصری تعلیم علیگڑھ مسلم یونی ورسٹی میں پائی، آل انڈیا ملی کونسل کے صدر نشین حضرت مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی نے ابھی تین روز پیشتر ہی کاتب الحروف کو بتایا کہ مولانا محمد اسلم قاسمی اور میرا سن پیدائش ایک ہی ہے اور ہم دونوں نے کنز الدقائق حضرت مولانا سید اختر حسین میاں دیوبندی سے پڑھی تھی، پھر دورۂ حدیث میں بھی درسی رفاقت رہی، یہ ۱۹۵۷ء کا سال تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے صرف تین ماہ بخاری شریف پڑھنے کا موقع ملا تھا کہ آپ نے دار فانی سے منہ موڑ لیا آپ کے وصال کے بعد حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ کو شاہی سے بحیثیت شیخ الحدیث لایا گیا اور پھر آپ نے ہی بخاری شریف پڑھائی۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس آپ عملاً دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوگئے، مگر اس وقت ایک ملازم کی حیثیت ہی سے آپ متعارف تھے درس وتدریس اور صحافت وخطابت کے میدان میں شناخت کا کوئی عنصر نہیں تھا، لیکن ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم کی انتظامیہ نے جب اجلاس صد سالہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو مولانا حامد الانصاری غازی کے بعد اس کے لئے بنائے گئے عارضی دفتر کے قائم مقام نگراں مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی ہی تھے، وہاں آپ کی انتظامی صلاحیتوں کا راز کھلا، پھر جب دارالعلوم میں نئی انتظامیہ تشکیل پائی اور وقف دارالعلوم کے نام سے ایک دوسرے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تو مولانا محمد اسلم قاسمی کی خوابیدہ صلاحیتوں نے بھی انگڑائیاں لینی شروع کردیں۔

چنانچہ درس وتدریس اور تقریر وتحریر کے میدان میں ان کی شناخت اس قدر تیزی سے ابھری کہ وہ اپنے اقران پر بھی بھاری سے دکھائی دینے لگے، حتی کہ قومی سطح پر ان کی پہچان تسلیم کی جانے لگی، اللہ جل وعلا نے واقعی ان کے اندر بے شمار خوبیاں ودیعت فرمائی تھیں، وہ نہایت ذہین اور زود فہم انسان تھے، ان کا مطالعہ بہت زیادہ وسعت پذیر تھا، قدیم وجدید مراجع علم ان کی نگاہوں کے سامنے تھے، حدیث، فقہ، تفسیر، ادب، بلاغت اور تاریخ اسلامی پر ان کی گہری نظر تھی، جبکہ سیرت النبی تو آپ کا خاص موضوع تھا، اس موضوع سے آپ کی دلچسپی عشق کی حد تک واقع ہوئی تھی، جو آپ کے عاشق رسول ہونے کی بدیہی دلیل ہے، اسی لئے آپ نے سیرت حلبیہ جیسی شاہکار عربی تصنیف کو اردو کے قالب میں ڈھالا اور ایک مقبول سیرت نگار کے طور پر علمی برادری نے آپ کے اس کام کو بنظر استحسان دیکھا، جبکہ دیگر موضوعات پر بھی آپ کے قلمی معرکے دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہیں کہ قاسمی خانوادہ کے اس گل سرسبد نے مولانا نانوتوی کے علمی نسب نامہ کی کس طرح حفاظت فرمائی اور علم وقلم کا ایسا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ مستقبل کا مورخ ان کی شخصیت اور خدمات سے صرف نظر کرنے کی ہمت نہ جٹا سکے گا، دارالعلوم وقف دیوبند کی تعمیر وترقی اور اس کے استحکام میں مولانا کی قربانیاں نقش دوام کی حیثیت رکھتی ہیں جو ان شاء اللہ ان کے حسنات میں اضافہ کا سبب ہوں گی۔

وہ اپنے بزرگوں اور پیش رو اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے نہایت یکسوئی کے ساتھ دینی وعلمی کاموں کو آگے بڑھا گئے، انکے حین حیات تو شاید لوگوں کو ان کی مقبولیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکا تھا مگر آپ کے جنازہ میں اہل علم کی امڈی بھیڑ اور سوشل میڈیا پر ہورہے ماتم سے یہ حقیقت تو بہرحال منکشف ہوگئی کہ لوگوں کے جگر ان کے حادثۂ رحلت سے چھلنی اور آنکھیں اشک بار ہیں، وہ زبان حال سے یہی کہہ رہے ہیں کہ یہ حادثہ محض قاسمی خانوادہ کا ذاتی صدمہ نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کا قیامت سے گذرنا ہے جنہیں فی الحقیقت ان کے وجود باجود کی قدرومنزلت کا کسی بھی درجہ میں ادراک تھا

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

اسی لئے یہاں گنگوہ میں جیسے ہی آپ کے وصال کی اطلاع ملی تو جامعہ کی علمی فضا سوگوار ہوگئی، یہاں اس صدمہ کی شدت بایں معنیٰ بھی تھی کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی جامعہ اور اس کے بانی حضرت مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ پر خاص توجہ تھی اور وہ بارہا یہاں تشریف لاکر خطاب اور دعا فرمایا کرتے تھے، اسی نسبت سے حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی بھی یہاں تشریف لاتے رہے اور کبھی امتحان لیکر اپنے تاثرات سے بھی آگاہ فرماتے، اب آپ رخصت ہوئے تو اپنی یادوں کے اجالے بھی چھوڑ گئے ہیں، اللہ آپ کو کروٹ کروٹ وہاں کی راحتیں نصیب فرمائے اور اپنا قرب عطا کرے، آمین۔

آسماں لحد پہ ان کی شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

استاذ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ



آسام میں دستک دے رہا ہے

روہنگیا جیسا بحران



افتخار گیلانی

آل انڈیا یونائیٹڈ فرنٹ کے صدر اور رکن پارلیمان مولانا بدرالدین اجمل نے جو جمعیۃ علما صوبہ آسام کے صدر بھی ہیں، موجودہ حالات کے لئے آسام کی کانگریس حکومتوں اور اس کی قیادت کو سب سے زیادہ ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان کا شمال مشرقی صوبہ آسام فی الوقت بارود کے ایک ڈھیر پر کھڑا ہے۔ برما کے روہنگیا مسلمانوں سے بھی شدید بحران اس خطہ کو عدم استحکام کی آگ میں جھونکنے کے لئے تیار نظر آرہا ہے۔ صوبہ کی ہندو قوم پرست بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی حکومت تقریباً 48 لاکھ مسلمانوں کی شہریت چھیننے اور ان کو بے حیثیت کرنے کی قواعد شروع کر چکی ہے اور یہ معاملہ برما سے بھی سنگین تر ہوتا جارہا ہے۔

چند روز قبل صوبہ کے بڑے شہر گوہاٹی سے پڑوسی ریاست میگھالیہ کے دارلحکومت شیلانگ کی طرف سفر کرتے ہوئے متعدد مقامات پر میں نے پولیس اور انتظامیہ کے اہلکاروں کو لاریوں اور کاروں کو روک کر مسافروں کے شناختی کارڈ چیک کرتے ہوئے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ غیر قانونی طور پر مقیم بنگلہ دیشیوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ شناختی کارڈ میں خامی ہو یا شکل سے کوئی بنگلہ دیشی نظر آیا، تو فی الفور بس سے اتار کر اور غیر ملکی ڈکلیئر کرکے اس کو کیمپ میں نظر بند کردیا جاتا ہے۔

مقتدر کانگریسی لیڈر اور صوبائی اسمبلی کے پہلے ڈپٹی اسپیکر محمد امیر الدین کا خاندان ہو یا سابق فوجی افسر محمد اعظم الحق، سبھی آجکل حیران و پریشان ہیں۔ ان کے خاندانوں کو پہلے ووٹر لسٹ سے خارج کیا گیا، اور بعد میں انہیں فارن ٹریبونل کی ایک اسپیشل بینچ کے سامنے ہندوستانی شہریت ثابت کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ امیر الدین 1930 سے آسام کے گاؤں کالی کا جاری کے مکین ہیں، جہاں مہاتما گاندھی کے علاوہ کئی وزرا اعظم جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی ان کے گھر پر حاضری دے چکے ہیں۔ محمد اعظم الحق نے پچھلے سال ہی فوج میں 30 سال تک نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوکر گوہاٹی سے متصل اپنے آبائی گاؤں میں سکونت اختیار کی تھی۔ اسی طرح پچھلے 25 سالوں سے مقامی پولیس کے ایک آفیسر ابوالحق کو بھی ہندوستانی شہریت ثابت کرنے کا نوٹس ملا ہے۔ جس میں ان کو کہا گیا ہے، کہ مقررہ مدت تک شہریت کے ثبوت پیش کریں، ورنہ انکو خاندان سمیت بنگلہ دیش کی طرف دھکیلا جائے گا۔ گوہاٹی سے 90 کلومیٹر دور بارپیٹہ میں جلد سازی کے ایک کاریگر معین ملا کسی کام کے لئے گھر سے باہر گئے ہوئے تھے کہ شاہراہ پر پولیس نے ان سے شناختی کارڈ مانگا، جو وہ گھر پر بھول گئے تھے۔ بس انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے پولیس نے غیر ملکی قرار دیکر حراست میں لیا۔ تلاش بسیار کے بعد ان کے خاندان کو پتہ چلا کہ ملا 100 کلومیٹر دور حراستی کیمپ میں نظر بند ہیں اور ان کو بنگلہ دیش بارڈر کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اگست 2017 سے جاری اس کاروائی میں اب تک 89,395 افراد کو غیر ملکی قرار دیکر حراستی کیمپوں میں نظر بند کیا جاچکا ہے۔

انصاف کے دوہرے معیار کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔ ایک طرف آسام میں مذہب کی بنیاد پر شہریت میں تفریق کی جارہی ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی مرکزی حکومت لاکھوں غیر ملکی ہندو پناہ گزینوں کو شہریت دلانے کے لئے قانون سازی کر رہی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان لاکھوں حقیقی شہریوں (genuine citizens) کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر ہندوستانی شہریت سے محروم کرنے کی منصوبہ بندی ہورہی ہے۔ گو کہ اس موجودہ صورت حال کے لئے آسام کی سابق کانگریس حکومتیں ذمہ دار ہیں، مگر ڈیڑھ سال قبل صوبہ میں بی جے پی کی حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی مسلمانوں کی تقریباً آدھی آبادی کو بنگلہ دیشی قرار دیکر سرحد پار دھکیلنے کی تیاری زور وشور سے جاری ہے۔ آبادی کے تناسب سے آسام میں مسلمان کل آبادی کا 34 فی صد ہیں اور 9 اضلاع میں ان کی واضح اکثریت ہے، جو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں کھٹک رہی ہے۔ آسام کی حقیقی آبادی اور بنگلہ دیشیوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے قومی شہری رجسٹر کا فارمولہ اختیار کیا گیا تھا، جس کی رو سے 16 دستاویزات کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ان میں سے پنچایت سرٹیفکیٹ بھی شامل ہے جو اس لڑکی کو دی جاتی ہے جو شادی کرکے دوسرے گاؤں یا علاقہ میں جاتی ہے۔ تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ یہ بنگلہ دیشی ہے۔ موجودہ حکومت نے اس سرٹیفکیٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ پولیس نے اس کو بہانہ بناکر دھر پکڑ شروع کردی ہے۔

صورت حال اس قدر بھیانک ہے کہ مسلم خواتین کو جو زیادہ تر کم عمر کی ہوتی ہیں، کو رات کو پولیس والے بغیر کسی خاتون پولیس کے گھر پر دھاوا بولتے ہیں اور دروازہ توڑ کر خواتین کو گرفتار کرکے ڈٹینشن کیمپ میں چھوڑ دیتے ہیں۔

معاملہ کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان خواتین کو مجرموں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ڈٹینشن کیمپ میں ایسی خواتین کی تعداد تقریباً دس ہزار کے قریب ہے۔ اکثر مسلمان خواتین کو کوکراجار، گوہاٹی اور گوال پارہ کی جیلوں میں نظر بند کیا گیا ہے۔ مقامی سماجی کارکن ابراہیم علی کے مطابق کئی جیلوں سے خواتین نے پولیس کی طرف سے ظلم و زیادتیوں کی شکایتیں کی ہے۔ اس صوبہ میں 1978 سے 1985 کے درمیان آل آسام اسٹوڈنٹس سمیت کچھ تنظیموں نے پہلے تو غیر آسامیوں یعنی ہندی بولنے والوں کے خلاف تحریک شروع کی پھر اس کا رخ غیر ملکیوں اور خاص کر بنگلہ دیشیوں کے خلاف موڑ دیا گیا بعد ازاں اسے آر ایس ایس اور دیگر فرقہ پرستوں کی شہ پر خونریز مسلم مخالف تحریک میں تبدیل کردیا گیا۔ اس خوفناک اور خون آشام تحریک نے ہزاروں بے گناہوں کی جانیں لیں اور کروڑوں روپے مالیت کی جائیدادیں تباہ و برباد کی گئیں۔

آسام کی تاریخ گواہ ہے کہ غیر ملکی اور خاص کر بنگلہ دیشی ہونے کا الزام لگا کر مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی جس میں 1983 کا نیلی (Nellie) اور چولکاوا کے قتل عام کے روح فرسا واقعات بھی فراموش نہیں کیے جاسکتے جس میں تقریباً تین ہزار لوگوں کو محض چھ گھنٹوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا مگر متاثرین کو آج تک انصاف نہیں مل سکا۔ 1985 میں اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کی نگرانی میں مرکزی حکومت، آسام حکومت اور احتجاجی طلبہ لیڈروں کے درمیان باہمی رضامندی سے معرض سے آسام آکارڈ وجود میں آیا اور اس وقت کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں نے اسے قبول کیا تھا۔ اس کے مطابق 25 مارچ 1971 (Cut off date) کو بنیاد مان کر اس سے پہلے آسام آکر بس جانے والوں کو ہندوستانی شہری تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد مرکزی حکومت نے پارلیامنٹ میں ایک ترمیمی بل کے ذریعہ Citizenship Act -1955 میں section 6-A داخل کرکے اسے منظوری دی جس پر اس وقت کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تمام سیاسی جماعتوں بشمول کانگریس، بی جے پی، کمیونسٹ جماعتوں نیز تمام غیر سیاسی وسماجی تنظیموں نے بھی اسے تسلیم کیا تھا۔ مگر ریاست میں مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت بننے سے روکنے کی غرض سے 2009 میں اور پھر 2012 میں آسام سنمیلیا مہاسنگھ سمیت مختلف فرقہ پرست اور مفاد پرست افراد اور تنظیموں نے سپریم کورٹ میں اس معاہدہ کے خلاف مفاد عامہ کی ایک عرضداشت داخل کرکے 25 مارچ 1971 کی بجائے 1951 کی ووٹر لسٹ کو بنیاد بناکر آسام میں شہریت کا فیصلہ کرنے کی استدعا کی نیز اس معاہدہ کی قانونی حیثیت اور پارلیامنٹ کے ذریعہ Citizenship Act -1955 میں Section 6-A کے اندراج کو بھی چیلنج کیا، جس کی وجہ سے آسام کے لاکھوں افراد بلکہ ہر تیسرے فرد پر شہریت کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔

آل انڈیا یونائیٹڈ فرنٹ کے صدر اور رکن پارلیمان مولانا بدرالدین اجمل نے جو جمعیۃ علما صوبہ آسام کے صدر بھی ہیں، موجودہ حالات کے لئے آسام کی کانگریس حکومتوں اور اس کی قیادت کو سب سے زیادہ ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اجمل نے جو ریاست کی ڈھبری حلقہ سے پارلیمنٹ میں نمائندگی کرتے ہیں اور انکی جماعت کے ریاستی اسمبلی میں 13 ارکان ہیں، سابق کانگریسی وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی کو خاص طور سے نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنے پندرہ سالہ دور حکومت میں (2001-16) ریاست کی لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو تین کاری ضربیں لگائیں۔ پہلے انہوں نے 2005 میں آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کا سپریم کورٹ میں کمزور دفاع کرکے اس کو منسوخ کرایا جس کے تحت کسی شخص کو غیر ملکی ثابت کرنے کی ذمہ داری انتظامیہ پر تھی۔ بنگلہ دیشی دراندازوں کا پتہ لگانے اور شناخت کرنے کی غرض سے آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ (Illegal Migrants Detection Tribunal) 1983 میں پاس کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت کسی فرد کو غیر ملکی ثابت کرنے کی ذمہ داری استغاثہ پر تھی اب یہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد ختم کردیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کی حکومت نے آسام میں "بارڈر پولیس ڈپارٹمنٹ" تشکیل دے کر اسے اس بات کا مکمل اختیار دے دیا کہ وہ جسے چاہے غیر ملکی قرار دے کر گرفتار کرسکتا ہے۔ ہزاروں معصوم لوگ اس ڈپارٹمنٹ کے ظلم وستم کا شکار ہو چکے ہیں۔۔۔ واضح رہے کہ ملک کی دیگر ریاستوں میں اس طرح کا کوئی محکمہ نہیں ہے۔ مزید ستم یہ کیا گیا کہ جن لوگوں کو گرفتار کرکے حراستی مراکز میں ڈالا گیا ان سے راشن کارڈ چھین لیے گئے۔

مسلم رہنماؤں کو احساس ہے کہ آسام کے مسلمانوں کو روہنگیا مسلمانوں کی طرح بے حیثیت کرنے کی سازش چل رہی ہے تاکہ ان کے شہری حقوق چھین لئے جائیں اور ان سے ووٹنگ کا حق بھی سلب کرلیا جائے۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا ارشد مدنی کے مطابق خواتین کے معاملے میں شہریت کے ثبوت کے طور پر گاؤں کی پنچایت کے سرٹیفکیٹ کو تسلیم نہ کئے جانے کا فیصلہ سنگین مسئلہ ہے، جو منصوبہ بند لگتا ہے۔ اسلام ریاست آسام کا دوسرا بڑا مذہب ہے جہاں 13 صدی میں سلطان بختیار خلجی کے دور میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت تک آہوم سلطنت وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ جب برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1757 کی جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر قبضہ کیا تو اس کے زیر تسلط آسام کا علاقہ بھی آیا۔ کمپنی نے یہاں بڑے پیمانے پر بنگالیوں کو لاکر بسانا شروع کیا اور ان لوگوں نے معاشی وجوہات سے اپنے رشتہ داروں کو یہاں بلانا شروع کیا۔ کیونکہ آسام میں زمینیں زرخیز تھیں۔ مشرقی بنگال سے بڑی تعداد میں بے زمین کسان یہاں آکر آباد ہوگئے جن میں 85 فی صد مسلمان تھے۔ آج انہی صدیوں سے آباد مسلمانوں کو غیر ملکی یا بنگلہ دیشی قرار دیکر ان کے لئے زمین تنگ کی جارہی ہے۔

(بہ شکریہ دی وائر اردو)



امریکا میں خوف کی صنعت میں کارفرما
اسرائیلی ہاتھ

زمردی جاوید

دنیا بھر میں قریباً ستر بلند و بالا دیواریں کھڑی کی گئی ہیں۔ ان کا واحد مقصد ایک ہی تھا اور وہ ممالک اور کمیونٹیوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنا تھا۔ یہ سب کچھ "سکیورٹی" کے نام پر حفظ ماتقدم کے طور پر کیا گیا ہے لیکن ان کا حقیقی مقصد بالعموم اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ ان میں سے متعدد اسرائیل نے فلسطین کی غیر قانونی طور پر قبضے میں لی گئی سرزمین پر تعمیر کی ہیں یا وہاں تعمیر کی جا رہی ہیں۔

اسرائیل کو اس طرح کی دیواروں کی تعمیر میں اب مہارت تامہ حاصل ہو چکی ہے اور وہ اس علم و فن کو اب امریکا اور دوسرے ممالک کو برآمد بھی کر رہا ہے۔ درحقیقت اسرائیل نے سکیورٹی کے تمام شعبے کو فلسطین پر غیر قانونی فوجی قبضے کی بنیاد پر استوار کیا ہے۔ ان تمام برسوں میں اس نے اجتماعی سزا کے فن میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ اس نے لاکھوں لوگوں کو پس دیوار، خندق یا فوجی چیک پوائنٹس کے اندر محصور کر دیا ہے۔ اس نے پوری آبادی ہی کے گرداگرد سکیورٹی مشینری لگا دی ہے۔ لاکھوں فلسطینیوں پر جنگیں مسلط کی ہیں اور ان پر نئے نئے اسرائیلی ہتھیار آزمائے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اسرائیل کے اس وسیع تر سکیورٹی بندوبست سے اسرائیلی عوام کو تحفظ کا کوئی احساس ہوا ہے اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اسرائیل کی مسلط کردہ جنگوں اور تعمیر کردہ دیواروں سے اجتماعی تنہائی کے احساس ہی کو تقویت ملی ہے اور اسرائیلیوں میں اس مقبول عام جذبے کو تقویت ملی ہے کہ "دنیا ہمارے خلاف" ہے۔ تاہم اس مشق سے بھاری مالی فوائد حاصل ہوئے ہیں اور اب اس کی دنیا بھر میں کامیابی سے مارکیٹنگ کی جا رہی ہے۔

امریکی اپنے ہی عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہیں اور ان میں موقع پرست سیاست دانوں اور خوف کا شکار میڈیا نے خوف و ہراس کی کیفیت کو دو چند کیا ہے۔ اس کے پیش نظر امریکا کی مارکیٹ اسرائیل کی سکیورٹی ٹیکنالوجیز کے لیے ایک فطری گھر بن چکی ہے۔ چنانچہ اسرائیل کے سرکاری اور نجی شعبے کی فرموں نے 11 ستمبر 2001ء کے بعد سے تو اربوں ڈالرز کھرے کر لیے ہیں۔

میڈیا نے پھر یہ نظریہ بھی فروخت کیا کہ امریکا کی دہشت گردی مخالف نام نہاد جنگ تو دراصل اسرائیل کی اپنی جنگ ہی کی عالمی توسیع ہے۔ اس کے بعد تو اسرائیلی مینوفیکچرر اور آگے بڑھے اور انھوں نے امریکی خوف و خدشات کی بنیاد پر دولت اینٹھنا شروع کر دی۔ بہ الفاظ دیگر اب امریکا میں خوف کی صنعت سب سے منافع بخش کاروبار بن چکی ہے جبکہ معیشت زبوں حال ہے اور تنخواہیں سکڑ رہی ہیں۔

> غزہ کی پٹی پر اسرائیلی فوج کے محاصرے کو مضبوط بنانے میں مدد دینے والی اسرائیلی فرم مجال سکیورٹی سسٹم امریکا کی سکیورٹی صنعت میں بھرپور طریقے سے فعال ہے۔ یہ ان کمپنیوں میں سے ایک ہے جو امریکا کو میکسیکو سے الگ تھلگ کرنے کے لیے دیوار کی تعمیر کر رہی ہیں۔ اسرائیل کے غیر قانونی حربے اب امریکا کے لیے ایک نمونہ قرار پائے ہیں اور ان کے ذریعے اب امریکی شہروں میں پولیس نظام نافذ کیا جا رہا ہے، اس کی سرحدوں کی نگرانی کی جا رہی ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کے بھی اصول و ضوابط وضع کیے جا رہے ہیں۔

امریکیوں میں پولیس کاری

درحقیقت اسرائیل کے نقش پا امریکا کے سکیورٹی آلات پر زیادہ نمایاں اور ابھر کر سامنے آ رہے ہیں اور اس کے عام امریکیوں کے حقوق پر ضرر رساں اثرات سیاست سے کہیں ماورا مرتب ہو رہے ہیں۔ امریکی سینیٹ کا بل ایس 720 اس ضمن میں چشم کشا ہونا چاہیے۔ اس بل کا مسودہ اسرائیلی لابی گروپ امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی نے اپنے 2017ء کے لابی ایجنڈے کے تحت تیار کیا ہے۔ اس خطرناک بل کے تحت ایسے کسی بھی شخص یا کمپنی کو سزا دی جا سکے گی جو اسرائیل کا فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی بنا پر بائیکاٹ کرے گا یا کرے گی۔ اس بل کے خلاف ابھی تک تو خاموش زبان ہی میں احتجاج کیا جا رہا ہے۔ امریکا کے مرکزی دھارے کے میڈیا نے ابھی تک اس معاملے پر امریکی قانون سازوں کو آڑے ہاتھوں نہیں لیا ہے جبکہ منتخب نمائندے اس قابل افسوس اقدام کی پہلے ہی توثیق کر چکے ہیں۔ امریکی حکومت میں اسرائیلیوں کی دراندازی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ناقدانہ آوازوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس کو مزید حوصلہ ملتا ہے کیونکہ یہ ناقدانہ آوازیں ہی اس مسئلے پر سنجیدہ بحث چھیڑ سکتی ہیں۔ گذشتہ برسوں کے دوران میں عام امریکی شہریوں کو تو ویسے ہی اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے پر تمام بحث سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ موضوع ہی غیر متعلقہ ٹھہرا ہے، ہالی وڈ کے پروپیگنڈے سے آلودہ ہو چکا ہے۔ مذہبی غلط تصورات اور تاریخ کی عدم تفہیم کے سبب اس موضوع میں عام شہری کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حالیہ برسوں کے دوران میں زیادہ تر لوگ اسرائیلی اثر و نفوذ سے متاثر نہیں ہوئے تو تب بھی اسرائیل امریکی زندگی کا لازمی داخلی جزو بن چکا ہے۔ ایلس سپری نے انٹرسیپٹ میں لکھا ہے کہ "نائن الیون کے حملوں کے بعد اسرائیل نے اپنے عشروں پر محیط تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو انسداد دہشت گردی میں ایک عالمی لیڈر کے طور پر پیش کیا تھا"۔ اس کامیاب پیش کاری پر اسرائیل کی سکیورٹی فرموں نے اربوں ڈالرز کمائے ہیں۔ بھاری رقوم کی یہ وصولی دراصل امریکی معاشرے میں پیدا کردہ دہشت گردی کے خوف کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے جبکہ اسرائیل کو دہشت گردی سے نمٹنے والے ایک کامیاب ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ گذشتہ دو عشروں کے دوران میں امریکا کے سیکڑوں وفاقی ایجنٹوں اور پولیس افسروں نے اسرائیل میں تربیت حاصل کی ہے یا انھوں نے اسرائیل کی جانب سے منعقدہ کردہ سیمی ناروں اور ورکشاپوں میں شرکت کی ہے۔

امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی، ازالہ حیثیت عرفی لیگ (اے ڈی ایل) اور جیوش انسٹی ٹیوٹ برائے قومی سلامتی امور جیسے گروپ امریکا کی پولیس فورس کو اسرائیل کی پولیس فورس کے ڈھانچے کی طرح استوار کرنے میں کسی نہ کسی شکل میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اسرائیل نے ایک قابض قوت کی حیثیت سے پولیس اور فوج کے درمیان فرق کی لکیر کو دھندلا دیا ہے۔ مقبوضہ فلسطین میں مشرقی یروشلم ایسے علاقوں میں پولیس اور فوج دونوں ایک ہی طرح اور ایک ہی انداز میں کام کرتی ہیں۔ وہ کسی بھی مشتبہ یا اشتعال انگیزی پر فلسطینیوں کو گولی مار کر موت کی نیند سلا دیتی ہیں۔ ایسے بیشتر واقعات میں گولی چلانے کا کوئی سبب ہی نہیں ہوتا ہے۔

بروکلین کالج میں سماجیات کے پروفیسر اور مصنف ایلکس ویتالے وفاقی ایجنٹوں اور پولیس افسروں کے اسرائیل کے آنے جانے کے دوروں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "جس بہت زیادہ پولیس کاری کا بہت زیادہ تجربہ کیا جا رہا ہے اور ان دوروں کے بارے میں جو گفتگو کی جا رہی ہے، تو یہ ایک ایسی پولیس کاری ہے جو غیر جمہوری سیاق و سباق میں وقوع پذیر ہو رہی ہے"۔ اس غیر جمہوری پولیس کاری کے ذریعے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں مقبوضہ فلسطینیوں سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے اور اکثر انھیں جان بوجھ کر جان سے ہی مار دیا جاتا ہے۔

امریکی حکومت چہ جائیکہ اسرائیل پر فلسطین پر غیر قانونی فوجی قبضے کے خاتمے کے لیے دباؤ ڈالے، وہ اسرائیلی مہارت کو اپنے ہی شہروں میں آزمانے کے لیے پر تول رہی ہے۔ درحقیقت امریکی فوج کی طرح پولیس کی مظہریت سے مقامی پولیس اہلکار عوام کے تحفظ کا حلف اٹھانے والے افراد کے بجائے ایک "قابض فورس" ہی نظر آنے لگے ہیں۔ اسرائیل اپنے قبضے کے حربوں کو اب امریکا کو برآمد کر رہا ہے۔ اسرائیلی فوج کے ٹھیکیدار امریکا بھر میں اپنے ذیلی ادارے کھول رہے ہیں۔ وہ وہاں نگرانی کی ٹیکنالوجیز، دیواروں، سرحدوں کی نگرانی کے آلات اور متشدد حربوں کی تشہیر کر رہے ہیں۔

میکسیکو کی سرحد کے ساتھ دیوار

اسرائیلی کمپنی ایلٹا شمالی امریکا (اسرائیل کی ایرو سپیس انڈسٹری کا ذیلی ادارہ) واحد غیر ملکی کمپنی تھی جس کو امریکا اور میکسیکو کے درمیان سرحد پر دیوار کی تعمیر کا نمونہ تیار کرنے کا ٹھیکا دیا گیا ہے۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران میں اس دیوار کی تعمیر کا وعدہ کیا تھا اور اسرائیل پہلا ملک تھا جس نے سب سے پہلے ٹرمپ کے فیصلے کی ان الفاظ میں تائید کی تھی۔ تب اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے ایک ٹویٹ میں لکھا تھا: "صدر ٹرمپ درست ہیں۔ میں نے اسرائیل کی جنوبی سرحد کے ساتھ ایک دیوار تعمیر کی ہے۔ اس نے غیر قانونی تارکین کی آمد کو روک دیا ہے۔ یہ ایک بڑی کامیابی ہے اور یہ ایک عظیم تجویز (آئیڈیا) ہے"۔

ڈونلڈ ٹرمپ کی اس حمایت پر میکسیکو اور بہت سی امریکی نیتن یاہو سے نالاں تو ضرور ہوئے تھے لیکن اسرائیلی وزیراعظم کو مستقبل میں منفعت بخش سرمایہ کاری کے مواقع نظر آ رہے تھے۔

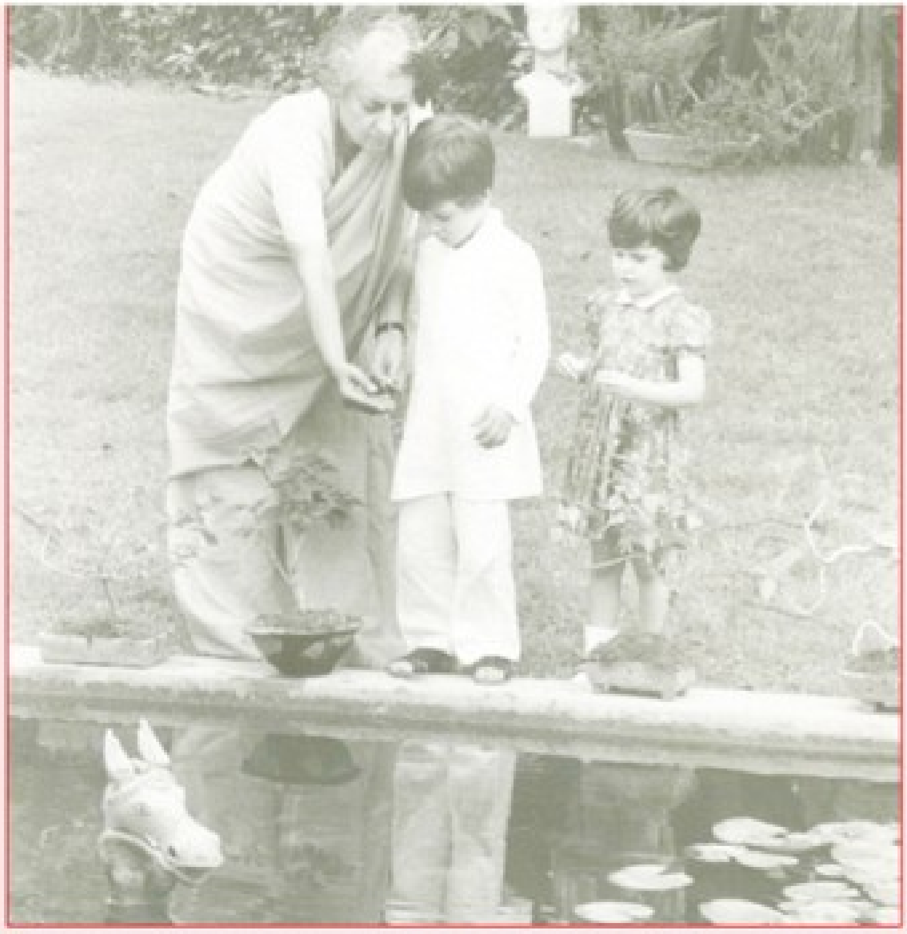
(باقی صفحہ 22 پر)

قبرستان برائے فروخت!

عبدالعزیز حسین الصاوی

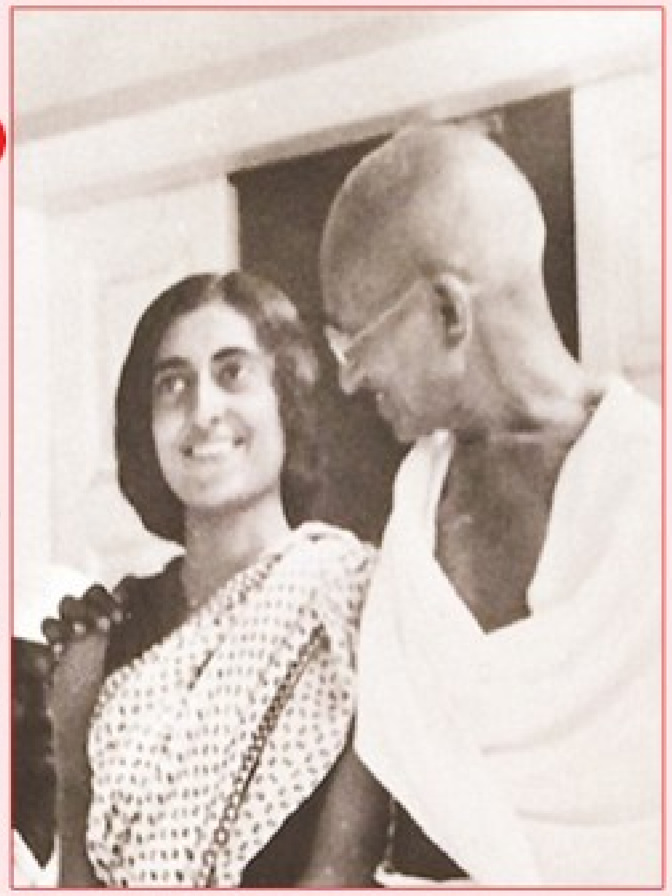


کئی مصری ٹی وی چینلز پر "قبرستان برائے فروخت" کے اشتہار دیکھ کر ہر کس و ناکس کو اچنبھا ہوتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اشتہار میں امیدواروں کو یہ اختیار بھی دیا جاتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو قبرستان کی مطلوبہ رقم نقد ادا کر دیں اور چاہیں قسطیں کروا لیں۔ اشتہار اس قدر دلچسپ پیرائے میں دیے جا رہے ہیں کہ مکان سے محروم ہر انسان کے دل میں یہ گدگدی ہونے لگتی ہے کہ اس سے بہتر موقع اور کیا ہوگا، کیوں نہ ایک شاندار گھر کے مالک بننے کا خواب شرمندہ تعبیر کرا لیا جائے۔ انسان کے ذہن میں مذکورہ اشتہار دیکھ کر یہ خواہش بھی پیدا ہونے لگتی ہے کہ اس سے بہتر اسکیم اور کیا ہوگی کہ آپ ایک ایسا مکان حاصل کریں جہاں اپنی زندگی گزاریں اور مرنے کے بعد بھی آپ کی رہائش اسی جگہ ہو جہاں آپ زندگی میں رہا کرتے تھے۔ قبرستان برائے فروخت کے اشتہارات میں جن قبرستانوں کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں وہ متمول علاقوں کے ان مکانات سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار ہوتے ہیں جہاں جیتے جاگتے لوگ اپنی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان اشتہارات کا بنیادی ہدف صرف منافع کمانا ہے یا موت کے کلچر کی مارکیٹنگ کرنا ہے۔ بعض قبرستانوں کی قیمت عوامی محلوں کے مکانات کے آس پاس ہوتی ہے۔ بعض قبرستانوں کی قیمتیں عام گھروں کی قیمتوں سے زیادہ بھی ہوتی ہیں۔ حقیقت حال سے آشنا لوگوں کا کہنا ہے کہ تعمیر فروشوں نے 25 جنوری 2011 کے انقلاب کے بعد مصر میں آنے والی بدامنی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مختلف مقامات پر بلا اجازت قبرستان بنا لیے تھے۔ انہوں نے بھاری قیمتوں پر انہیں فروخت کر دیا۔ قبرستانوں کی ضرورت کے حوالے سے عوام کا استحصال کیا۔ اب یہ قبرستان اس لیے بھی فروخت کر رہے ہیں تاکہ حکومت مستقبل میں انہیں غیر قانونی قرار دے کر ضبط نہ کر لے۔ آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ مقام شکر ہے کہ سعودی وزارت بلدیات و دیہی امور نے سوشل میڈیا پر گردش کرنے والی اس اطلاع کی تردید کر دی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ سعودی حکومت قبرستانوں پر ٹیکس لگانے جا رہی ہے۔ (بشکریہ روزنامہ المدینہ)





سیاست کیلئے موٹی چمڑی ضروری ہے: اندرا گاندھی



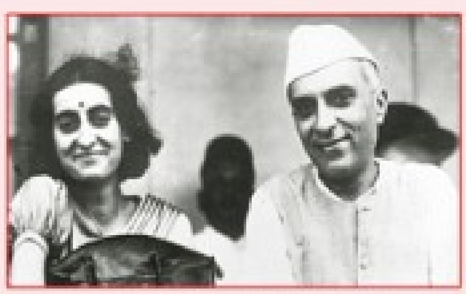
نٹور سنگھ
سابق انڈین وزیر خارجہ

اندرا گاندھی کو زیادہ تر ایک سخت مزاج شخصیت کے طور پر دکھایا جاتا رہا ہے۔ ان کی شخصیت کے خوش دل اور ہمدرد پہلو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہی رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عمدہ مقرر تھیں اور سیاست سے باہر کی چیزوں میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ وہ باغ و بہار شخصیت کی مالکہ تھیں اور ان کے حلقے میں فنکار، مصنف، مصور اور دوسرے باصلاحیت افراد شامل تھے۔ 31 اکتوبر 1984 کو جب انھیں قتل کیا گیا تھا تو میری زندگی سے جیسے موسم بہار ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں ہمیشہ ہر ایک کا احترام کروں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں، انھوں نے مجھے جو سکھایا ہے وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید جو میں جانتا ہوں، انھوں نے اس سے کہیں زیادہ مجھے دیا ہے۔ وہ ان لوگوں سے قدرے کم ہمدردی رکھتی تھیں جو اپنی زندگی کے بارے کچھ زیادہ ہی سوچ بچار سے کام لیتے تھے، یا مسائل کا سامنا کرنے سے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

جو لوگ دکھاوا کرتے تھے انھیں ان کی ایک تیکھی نظر چاروں شانے چت کر دیتی تھی۔ انھوں نے بہت سے سماجی اور سیاسی بندھنوں کو توڑا۔ یہ آزادی کے جھونکے کی طرح تھیں جو طاقت سے بھرپور تھا۔ 28 اگست 1968 میں انھوں نے اپنے ہاتھ سے مجھے خط لکھا۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا جسے انھوں نے میرے بیٹے جگت کی پیدائش پر لکھا تھا۔

پیارے نٹور،

جب میرے سیکریٹری نے مجھے یہ خوش خبری سنائی تو میں نے آپ سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن کسی وجہ سے میں بات نہیں کر پائی۔ آپ کے گھر میں ننھے مہمان کی آمد پر میں آپ کو تہہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں۔ خدا کرے وہ آپ کے لیے خوشیاں لے کر آئے اور بڑے ہونے پر آپ کے لیے فخر کا باعث ہو۔





آپ کی مخلص،
اندرا گاندھی

جب یاسر عرفات ناراض ہو گئے: غیر وابستہ تحریک کی ساتویں کانفرنس سات مارچ، 1983 کو منعقد کی جا رہی تھی۔ یہ کانفرنس نئی دہلی کے وگیان بھون میں منعقد ہوئی۔ میں اس وقت سیکریٹری جنرل تھا۔

کانفرنس کے پہلے دن ہمیں ایک بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑا کہ فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے چیئرمین یاسر عرفات کی ناراضی کیسے دور کی جائے۔ ان کی تقریر سے پہلے اردن کے بادشاہ کو بولنا تھا، اور وہ اسے اپنی توہین سمجھ بیٹھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دہلی سے لوٹ جائیں گے۔ میں نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے پوچھا کہ کیا وہ فوری طور پر وگیان بھون آ سکتی ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ وہ کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو کو بھی ساتھ لے آئیں۔ انھوں نے کاسترو کو سارا معاملہ سمجھا دیا۔ کاسترو نے فوری طور پر عرفات کو ایک پیغام بھیجا۔

کاسترو نے عرفات سے پوچھا: کیا آپ اندرا گاندھی کے دوست ہیں؟ عرفات نے کہا: دوست، وہ میری بڑی بہن ہے، میں ان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔

کاسترو پلٹ کر کہا: پھر چھوٹے بھائی کی طرح پیش آنا اور دوپہر کے سیشن میں حصہ لینا۔ اس کے بعد عرفات نے کانفرنس میں حصہ لیا۔

ملکہ کی ناراضی: نومبر 1983 میں نئی دہلی میں دولتِ مشترکہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ میں اس اجلاس کے منتظمین میں شامل تھا۔ کانفرنس کے دوسرے ہی دن ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اندرا گاندھی کو پتہ چلا کہ ملکہ الزبیتھ ایوان صدر میں مدر ٹریسا کو میرٹ آرڈر دینے کے لیے تقریب منعقد کر رہی ہیں۔

وزیر اعظم گاندھی نے مجھے تحقیقات کا حکم دیا۔ پتہ چلا کہ واقعی ایسی تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایوان صدر میں خود صدر کے علاوہ کوئی اور تقریب منعقد نہیں کر سکتا۔

وزیر اعظم نے مجھے بتایا کہ میں برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کو بتاؤں کہ ملکہ برطانیہ کو ایوان صدر میں تقریب کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جب میں نے مسز تھیچر سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ جگہ تبدیل کرنے کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے اور اب ایسا کرنے سے ملکہ ناراض ہو جائیں گی۔ میں نے اندرا جی کو بتایا۔ وہ یہ سن کر ناراض ہو گئیں اور مجھے دوبارہ مسز تھیچر سے بات کرنے کے لیے کہا اور کہا کہ دوسرے روز یہ معاملہ پارلیمان میں اٹھے گا اور ملکہ کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس بات نے مسئلہ حل کر دیا اور ملکہ نے ایوان صدر کے باغیچے میں مدر ٹریسا کو اعزاز سے نوازا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ مدر ٹریسا کو اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔



موٹی چمڑی: دولتِ مشترکہ کے اجلاس کے آخری دن میں نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی اجازت کی۔ میں ان سے کہا کہ میں 31 سال تک انڈین خارجہ سروس کا حصہ رہا ہوں اور اب میں اس کام کو الوداع کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر وہ اجازت دے تو میں سیاست میں قدم رکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے اجازت دی۔ میری 28 نومبر کو جنوبی بلاک میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ ایک یا دو دن میں بھرت پور چلا جاؤں گا اور سیاسی زندگی کے لیے میری پہلی ترجیح اپنے لیے نئے کپڑے یعنی کرتا پاجامہ خریدنا ہے۔ انھوں نے کہا، اب آپ سیاست میں قدم رکھ رہے ہیں، اس کے لیے موٹی چمڑی کا ہونا بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔

کانگریس کے رہنما نٹور سنگھ سابق انڈین وزیر خارجہ ہیں۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی ون لائف از ناٹ انف میں اندرا گاندھی اور ان کے خاندان کے بارے میں لکھا ہے۔



سیکولرازم اور مقبول ہندوستانی سینما

شیام بینیگل

'گرم ہوا' پہلی فلم تھی جس میں تقسیم ملک کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کے تجربے کو سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ گرم ہوا کے بننے سے پہلے تک مقبول ہندی فلموں میں خاص کر مسلم کرداروں کو ٹوکن کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اگر مقبول عام سینما (Popular Cinema) نے آزمودہ فارمولوں کی بنیاد پر عمل کیا جن میں مذہبی اور نسلی اقلیتوں نے شاذ و نادر ہی کسی فلم میں مرکزی کردار ادا کیا ہے (اگر کسی فلم میں ایک مسلمان کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو صرف ایک مسلم معاشرے اور مسلم ماحول میں ایسا ہونا ممکن تھا)، تو 'جدید سینما' کی یہ خصوصیت تھی کہ بازار کے دباؤ سے آزاد ہو کر اس نے بہت سے نازک سماجی موضوعات کو اختیار کیا۔ 1969ء میں فلم انسٹی ٹیوٹ کے ایک گریجویٹ منی کول نے اپنی فلم 'اس کی روٹی' بنائی جس میں ایک سکھ نے مرکزی کردار ادا کیا جو بذات خود مقبول ہندی فلم کے بے شناخت ہندو ہیرو کے خلاف ایک سیاسی اعلان ثابت ہوا۔ فلم فائنینس کارپوریشن کے مالی تعاون سے بنائی گئی اہم ترین فلموں میں ایک ایم۔ ایس۔ ستھیو (M.S. Sathyus) کی فلم 'گرم ہوا' (1973) تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس میں تقسیم ملک کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کے تجربے کو سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ جیسا کہ اس سے پہلے میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ 'گرم ہوا' کے بننے سے پہلے تک مقبول ہندی فلموں میں خاص کر مسلم کرداروں کو ٹوکن (علامت) کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور اکثر ان میں کسی طرح کا عیب نہیں پایا جاتا تھا۔ اس طرح ان کو موثر انداز میں 'غیر' بنا کر اپنے فرقے سے الگ حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔

عصمت چغتائی کے ایک مختصر افسانے کی بنیاد پر کیفی اعظمی کی تحریر کردہ فلم 'گرم ہوا' میں شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے ایک مسلم خاندان کی تکلیف دہ صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو تقسیم ملک کے وقت پیدا شدہ غیر معمولی حالات پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اس خاندان کو یہ تکلیف دہ فیصلہ کرنا تھا کہ ایسی حالت میں اسے اپنے آبائی وطن آگرہ (ہندوستان) میں رہنا چاہیے یا ترک وطن کرکے پاکستان چلا جانا چاہیے۔ اس فلم کی کہانی میں ایک بڑے مشترکہ خاندان کی تقسیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کے ممبر مختلف وجوہات کی بنا پر انفرادی طور سے پاکستان روانہ ہو جاتے ہیں مگر اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے برخلاف فلم کا ہیرو سلیم مرزا اس نئے مسلم ملک کو ہجرت کرنے سے انکار کرتا ہے کیونکہ اسے اس مقام سے یعنی آگرہ سے گہری انسیت ہے۔ یہ فلم اس بات کا سراغ لگاتی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کے خلاف شک اور عدم اعتماد کی فضا میں سلیم مرزا کی قوت برداشت جواب دے گئی اور آخر کار نوبت یہاں تک پہونچی کہ اس کو یہ تکلیف دہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جو لوگ بھی خاندان کے بچ گئے ہیں ان کے ساتھ وہ بھی ترک وطن کرکے یہاں سے چلا جائے۔ بہرکیف مظلوموں کی وفاداری کی تصدیق و توثیق کرنے والے ایک کمیونسٹ جلوس سے متاثر ہو کر فلم کے آخری مرحلے میں مرزا اور اس کا چھوٹا بیٹا سکندر اپنی تمام مشقت اور پریشانی کے باوجود اپنا فیصلہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اس کا اختتام انتہائی مثبت انداز میں سیکولر قوم پرستی کا عکاس ہے تاہم 'گرم ہوا' تنہا ایسی فلم ہے جس نے مسلمانوں کی اس تکلیف دہ صورت حال کی تصویر کشی کی ہے جو انہیں تقسیم ہند کے نتیجے میں آزادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں پیش آئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مسلم فرقے کے ایک طبقے کی جانب سے اس فلم کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی جنہوں نے گورنمنٹ سے اس فلم پر پابندی عائد کرنے کی اپیل کر دی۔ خود فلموں کو دکھانے کی اجازت دینے والے حضرات (Censors) کوئی فیصلہ نہ کر سکے لہٰذا فلم بننے کے برسوں بعد آخر کار اسے نمائش کے لیے جاری کیا گیا۔ اس فلم کو پورے ملک میں ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہی دیکھنے کا موقع حاصل ہو سکا۔

اگر حکومت کے مالی تعاون سے چلنے والی ایجنسیوں کا نظام ایک طرف 'گرم ہوا' جیسی فلموں کی تیاری میں مددگار ثابت ہوا تو میری رائے میں تاریخی صورت حال کا بھی ایسی فلم کے بننے میں اہم کردار رہا ہے۔ یہ بات غیر اہم نہیں ہے کہ 'گرم ہوا' 1971ء میں بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد بنائی گئی تھی۔ آزادی کے بعد ابتدائی بیس سال تک مسلمانوں کے لیے ترک وطن اور ہجرت کا زمانہ تھا کیونکہ اس وقت بھی پاکستان ان کی توجہ کا مرکز تھا لیکن یہ رجحان اچانک بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد پورے طور پر غائب ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ لسانی بنیاد پر بنی۔ اس بار پاکستان کی اس نئی تقسیم نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی الجھنوں کو کسی حد تک کم کرنے میں مدد کی۔ ہندوستان کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری اب شکوک کے دائرے سے باہر اور قوم پرستی کی الجھن سے دور ہو سکی لہٰذا اب ستھیو ایسے موضوع کا انتخاب کر سکتے تھے جسے اس وقت تک نظر انداز کیا جا رہا تھا یا زیادہ تر معروف فلم ساز جس کا محض ایک ہلکا سا اشارہ دیتے تھے۔ کیونکہ 1971ء سے پہلے اس قسم کی فلم بنانا ناممکن تھا۔

'جدید سینما' کے اندر 70ء اور 80ء کی دہائی میں معاصر مسلم تجربے پر مبنی کہانیاں منظر عام پر آ گئیں۔ مظفر علی نے 1978ء میں 'گمن' (Gaman) اور 1986ء میں 'انجمن' (Anjuman) نام کی فلمیں بنائیں۔ پہلی فلم ممبئی کے ایک مسلم ٹیکسی ڈرائیور کے متعلق ہے جبکہ دوسری فلم لکھنؤ میں 'چکن' کا کام کرنے والے مسلمانوں کی زندگی کی دستاویزی شہادت فراہم کرتی ہے۔ ستیہ جیت رے نے 1857ء کے واقعہ سے متعلق پریم چند کی کہانی پر مبنی فلم شطرنج کے کھلاڑی 1977ء میں بنائی اور میں نے 1978ء میں 'جنون' نام کی فلم بنائی۔ جو اتر پردیش کی ایک فوجی چھاؤنی والے چھوٹے سے شہر کے واقعات پر مبنی ہے جن کا تعلق ہندو، مسلم، اینگلو انڈین اور برطانوی جیسے مختلف فرقوں کے تجربات سے ہے جو اس شورش کا شکار ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہی 1980ء میں سعید مرزا نے ممبئی میں مقیم گوا کے ایک کیتھولک عیسائی خاندان کے متعلق فلم 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے؟' اور اس کے بعد 1989ء میں 'سلیم لنگڑے پہ مت رو' نام کی فلم بنائی جس کا تعلق مسلم بستی جھونپڑی میں رہنے والے ایک نوجوان چور سے تھا۔ میں نے 1985ء میں 'تریکال' نام کی ایک فلم بنائی جو گوا کی آزادی کے وقت گوا کے ایک گاؤں میں مقیم ایک مراعات یافتہ کیتھولک عیسائی فیملی سے متعلق تھی۔ اس سے پہلے اقلیتی فرقوں کے بارے متعلق مضامین کو نبھانے میں فلم سازوں کو جس کم ہمتی کا احساس ہوتا تھا اب اس کی جگہ نئے اعتماد اور حوصلے نے لے لی۔ اقلیتوں کی بے جان اور لاحاصل نمائندگی کی جگہ جو 1971ء سے پہلے ہندوستانی سینما کا ایک خاصہ تھی اب ان فلموں میں ایسے معمولی قسم کے لوگوں کو بھی پیش کیا جانے لگا جو جدید دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہو رہے تھے۔ میں نے اوپر جن فلموں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بہت سی فلموں کو بے حد عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور کچھ کو معقول طریقے سے باکس آفس (Box Office) کی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

بہرحال پہلی فلم جس نے تقسیم ملک کے دوران ہندو مسلم اختلافات کے مسئلے کو پیش کیا وہ بھیشم ساہنی کے ناول 'تمس' پر مبنی ہے جسے گووند نہلانی نے 1987ء میں منی سیریز کی شکل میں بنایا تھا۔ اس سیریز کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فلم سنسر بورڈ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی، چونکہ یہ ٹیلی ویژن کے لیے تیار کی گئی تھی، ورنہ سنسر اس بنیاد پر اس کے اوپر پابندی عائد کر دیتا کہ اس میں دو فرقوں کے درمیان عداوت اور جنگ و جدال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جس وقت نیشنل ٹیلی ویژن چینل 'دوردرشن' اسے ٹیلی کاسٹ کرنے پر غور کر رہا تھا اس وقت آر۔ ایس۔ ایس اور اس کی دیگر ہمنوا جماعتوں نے اس کو دکھائے جانے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ممبئی میں واقع نہلانی کی قیام گاہ پر حملہ کیا گیا اور ان کو جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوردرشن نے سیریز کو نہ دکھانے کا فیصلہ اس عذر کی بنا پر کیا کہ اس سے نقص امن کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کیونکہ دائیں بازو کی ہندو تنظیموں نے بھی ٹیلی ویژن اسٹیشن کو نذر آتش کرنے کی دھمکی دی تھی۔ نہلانی نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سیریز کو ملاحظہ کرنے کے بعد ممبئی ہائی کورٹ نے دوردرشن کو اسے دکھلانے کی ہدایت دی۔ کیوں کہ اس فلم میں کوئی ایسی بات خلاف دستور نہیں تھی جس پر پابندی عائد کی جاتی۔ اس کے بعد ہی پوری فلم دوردرشن پر ایسے وقت دکھایا گیا جب بڑی تعداد میں ٹی وی دیکھا جاتا ہے۔ تین شاموں تک دیکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے اس فلم کو دیکھا اور اس دوران کوئی (ناخوشگوار) واقعہ نہیں ہوا۔

1986ء میں جب راجیو گاندھی کی حکومت نے دستور ہند میں ترمیم کے ذریعہ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو رد کر دیا تو اس نے ملک کی سیکولر حیثیت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا۔ یہ ایک طرف مسلم بنیاد پرستی کو سہولت و رعایت دینے کے مترادف تھا، دوسری طرف یہ اقدام مسلم خواتین کے حقوق پر زبردست حملہ تھا۔ مزید یہ کہ اس نے مسلم فرقے کے سیکولر طبقے کو مصالحت پر آمادہ کیا اور دائیں بازو کی ہندو سیاسی تنظیموں کو موقع فراہم کیا کہ وہ حکومت پر اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جانبداری و ہمدردی کا الزام عائد کریں۔ ایل۔ کے۔ اڈوانی نے اس وقت Pseudo-Secularism (نقلی سیکولرزم) کی اصطلاح ایجاد کی اور سیکولرسٹ طبقے پر (کسی حد تک معقولیت کے ساتھ) یہ الزام عائد کیا کہ ان کا رویہ تمام مذہبی فرقوں کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ اس کے سیاسی نتائج بہت دور رس تھے۔ اس نے رام جنم بھومی کے مسئلے کو اجاگر کیا جس کے نتیجے میں بابری مسجد کے انہدام کا حادثہ پیش آیا جس نے ایک بار پھر مسلم اور ہندو فرقوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کا بیج ڈال دیا۔

شاہ بانو کیس کے اہم واقعے کے بعد 1988-89ء میں میں نے ایک بڑی ٹیلی ویژن سیریز 'بھارت ایک کھوج' بنانا شروع کی جو جواہر لعل نہرو کی کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' (discovery of India) پر مبنی تھی۔ اس کتاب میں بہت سی خامیوں کے باوجود اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کی رنگارنگ و متنوع خصوصیات کو نمایاں کیا جائے اور ملک کے لیے ایک سیکولر نظریے کی نشاندہی کی جائے۔ جب کہ رامائن اور مہابھارت کو پورے ہند میں ٹیلی ویژن پر دیکھنے والوں کی تعداد کے نقطۂ نظر سے بلند ترین درجہ حاصل ہوا 'بھارت ایک کھوج' اس مقابلے میں تیسرے نمبر پر رہی۔ دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیے جانے پر اس کے دیکھنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ 80ء اور 90ء کی دہائی کے دوران ہندوستان میں بی۔ جے۔ پی کے ظہور کے نتیجے میں 'پاپولر سینما' کے اندر تبدیلیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ایٹمی تجربات کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کے نتیجے میں پاکستان کی مخالفت کی بنیاد پر قائم جنگ جویانہ وطن پرستی 'پاپولر ہندی سینما' کا اہم مرکزی موضوع بن گیا۔ جیسا کہ اس کی توقع کی جاتی تھی نیشنلزم (Nationalism) اور اس کے نتیجے میں سیکولرزم (Secularizm) کی تعریف کافی حد تک محدود کر دی گئی اور صرف ہندو فرقے کے لیے بالکل بلا شرکت غیرے مخصوص و محفوظ کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر جے۔ پی۔ دتا کی فلم 'بارڈر' 1997ء میں جو 1965ء کی ہند پاک جنگ کے ایک مورچے کا حال بیان کرتی ہے پاکستان (یعنی مسلم) انتہا پسندی کے مقابلہ میں ہندوستانی (یعنی ہندو) قیاس پر خاصا زور ہے اور جس میں 'پاکستانی' اور 'مسلم' دونوں کو مترادف اور ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ جنگ جویانہ پالیسی کا مظاہرہ فلم 'غدر' (2001ء) میں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر ہٹ ہو گئیں اور شمالی ہند کے صوبوں میں خاص طور سے کامیاب رہیں۔ بہرکیف اگر ایک جانب ہندتوا سیاست کے عروج نے مسلم مخالفت پر مبنی سلسلہ وار فلموں کی تخلیق کا راستہ ہموار کیا تو دوسری جانب 'لگان' جیسی بے حد کامیاب فلموں کے ابھرنے کا موقع بھی فراہم کیا جن میں ایک جامع سیکولر نظریے کو نیشنلزم (قوم پرستی) کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں 'ممو' (1995ء)، 'نسیم' (1995ء)، 'فضا' (2000ء) اور 'ہمنا ہے' جیسی فلمیں منظر عام پر آ گئیں جن میں ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کے مقام و مرتبے کی عکاسی کی گئی ہے۔

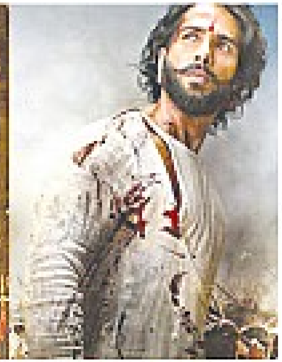
(باقی صفحہ 22 پر)







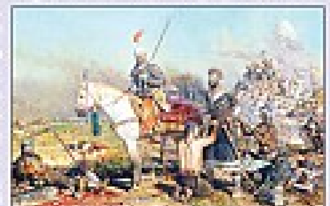




دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا



اصل میں ناانصافی علاء الدین خلجی کے ساتھ ہوئی





ہریانہ کا تخلیقی بیانیہ



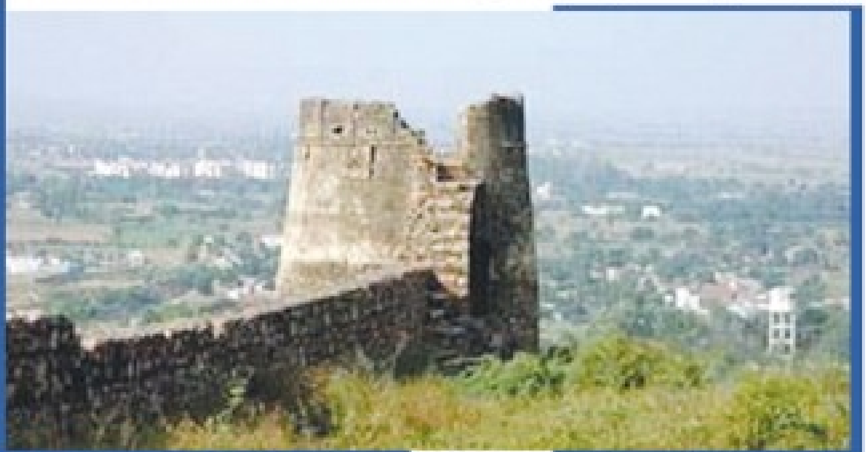
حقانی القاسمی

ہریانہ کی خاک سے ہی چمکا وہ ستارہ جسے دنیائے شعر و ادب ناصر کاظمی کے نام سے جانتی ہے جن کی شاعری خوب صورت استعاروں اور چھوٹی بحروں کی وجہ سے مقبول ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کے احساس محرومی سے متاثر ناصر کاظمی کا جنم انبالہ کے محلہ قاضی واڑہ میں 8 دسمبر 1925 میں ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت انہوں نے پاکستان کی طرف رخ کیا اور وہیں کے شہر لاہور کی خاک ان کی آخری آرام گاہ بنی۔

اسی سرزمین سے خواجہ احمد عباس جیسے متنوع اور کثیر الجہات شخصیت کا تعلق ہے۔ جنہوں نے امیتابھ بچن جیسے سپر اسٹار کو اپنی فلم سات ہندوستانی میں اداکاری کا موقع دے کر ان کے فلمی کیریئر کو زندگی عطا کی ہے۔ جن کا آخری صفحہ بہت مقبول و مشہور تھا اور اس کی وجہ سے لوگ ہفت روزہ بلٹز بمبئی کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ خواجہ احمد عباس نے بلٹز اور بمبئی کرانیکل میں جو کالم لکھے وہ شائع ہو چکے ہیں۔ بلٹز میں لکھے گئے کالم بریڈ بیوٹی اور ریولیوشن کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ آرٹ، موسیقی، فلم، ادب اور دیگر چھوٹے بڑے مسائل پر کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کا نظریہ ترقی پسندانہ تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے خواجہ احمد عباس ایک فلم ڈائریکٹر، ناولسٹ، اسکرین رائٹر اور صحافی کی حیثیت سے اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے جہاں انقلاب جیسا ناول دیا، وہیں ابابیل جیسی کہانی لکھی۔ سات ہندوستانی، شہر اور سپنا، راجکپور کی فلمیں، آوارہ، شری 420 اور میرا نام جوکر جیسی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ ایک بڑا ادیب جس نے ٹالسٹائی، موپاساں، گورکی، بالزاک، ہیمنگ وے جیسے ادیبوں کو پڑھا تھا۔ انہیں سیاست، تاریخ، معاشیات، قانون اور سائنس تمام علوم سے آگہی تھی۔ وہ اپٹا کے بانی بھی تھے اور نیو ویو فلمز کے محرک بھی۔ انہوں نے آڈیو ویژول میڈیا کا استعمال عوام کی سماجی زندگی میں ریڈیکل تبدیلی لانے کے لیے بھی کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ہی مشہور فلم بابی کی کہانی لکھی تھی جو بقول زاہدہ زیدی، دو طبقوں اور دو نسلوں کے تصادم کی داستان ہے، جس میں برق رفتار تبدیلیوں کے دور اور ٹوٹتی بکھرتی اقدار کے پس منظر میں دو نوجوانوں کی والہانہ محبت کو جو مثبت اقدار کا سرچشمہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بڑے دلکش انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

ہریانہ کی خاک سے ہی چمکا وہ ستارہ جسے دنیائے شعر و ادب ناصر کاظمی کے نام سے جانتی ہے جن کی شاعری خوب صورت استعاروں اور چھوٹی بحروں کی وجہ سے مقبول ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کے احساس محرومی سے متاثر ناصر کاظمی کا جنم انبالہ کے محلہ قاضی واڑہ میں 8 دسمبر 1925 میں ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت انہوں نے پاکستان کی طرف رخ کیا اور وہیں کے شہر لاہور کی خاک ان کی آخری آرام گاہ بنی۔ دو مارچ 1972 میں لوگوں نے شدت سے محسوس کیا کہ شعری کائنات میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ برگ نو، پہلی بارش، نشاط خاک، سر کی چھایا ان کی تخلیقی حرکیت اور انفرادیت کے روشن استعارے ہیں۔ درد و کرب کی پرچھائیوں اور گلی دوراں کے عکس نے ان کے تغزل کو توانائی عطا کی ہے۔ شہر اور یاد کے تلازماتی سلسلے ان کی شاعری میں روشن ہیں، اور ان ہی سلسلوں نے ان کے ساز سخن کو نیا طرز بھی عطا کیا ہے۔

برطانیہ میں مقیم عاشور کاظمی کا تعلق بھی ہریانہ کے پانی پت کے نواح فرید پور سادات سے ہے، جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک انسان دوست تخلیق کار اور دانشور ہیں۔ مختلف سطحوں پر متحرک عاشور کاظمی نے افسانے، انشائیے، خاکے بھی لکھے ہیں۔ تنقیدی نگارشات سے بھی اردو ادب کو مالا مال کیا ہے اور مشرق و مغرب کے مابین ثقافتی خلیج کو پاٹنے کا بھی کام کیا ہے۔ وہ ایک بہترین عمدہ نثر نگار بھی ہیں اور منفرد طور طرز کے شاعر بھی جن کی شاعری میں میر انیس کا سوز بھی ہے اور جوش کی انقلابی گھن گرج بھی کہ یہی دونوں ان کے فکری رہنما ہیں۔ ان کا لہجہ مزاحمتی اور رنگ انقلابی ہے۔ کربلا بطور شعری استعارہ ان کی شاعری کے بین السطور میں بھی روشن ہے:



جو چپ رہے تو ہوئے سربلند نیزوں پر
اٹھائی تیغ تو دنیا میں آشتی پھیلی
پانی پہ جو قبضہ کیا افواج ستم نے
پیاسوں نے بھی دریا کو پلٹ کر نہیں دیکھا
جہاں نشان محبت ملا جبیں رکھ دی
یزیدیت نظر آئی تو سر اٹھا کے چلے

ان کی شاعری میں کربلائی عزم بھی ہے اور تشنگی بھی۔ ایک طاقت ور توانا لہجہ کا شاعر جسے آشوب کائنات کا شدت سے احساس ہے اور جو کربلا کو عصری تناظر میں بھی محسوس کر رہا ہے:

بارود کے دہانے پہ بیٹھی ہوئی حیات
خوابوں میں رنگ بھرتی ہے اکثر نئے نئے
گھر کے دربانوں نے سارے گھر پہ قبضہ کر لیا
ہم نے آنکھیں کھولنے میں کس قدر تاخیر کی
ہمارے خون سے روشن چراغ میخانہ
یہ اور بات ہے ساقی ہمیں نہ پہچانے
مرا نسب اسی تاریخ کا حوالہ ہے
جہاں چراغ بجھائے تو روشنی پھیلی

اسی روشنی کی تلاش ہے عاشور کاظمی کو اور یہ صرف اور صرف حسینی عزم میں پنہاں ہے۔ عاشور اپنی شاعری کے ذریعہ یہی روشنی پھیلانا چاہتے ہیں کہ بقول قاسم خورشید، عاشور جانتے ہیں کہ تیرگی کے سلسلے کو توڑنے کے لیے قدروں کو زندہ رکھنا بہرحال ضروری ہے۔"

ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر فسانہ کہیں جسے بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں، سخن گسترانہ بات اور دیگر تصنیفات سے عاشور کاظمی کی متنوع تخلیقی، تنقیدی جہتوں کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ ان کی فکری کائنات وسیع ہے اور تخلیقی کینوس بھی تابناک ہے۔ ان کا یہ شعر:

وسعت رہی نظروں میں رکھا دل بھی کشادہ
عاشور نے دنیا کو سمٹ کر نہیں دیکھا

پروفیسر وہاب اشرفی کے اس خیال کی تائید ہے کہ:

"عاشور کاظمی بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں ترقی پسندی دراصل نئی ترقی پسندی ہے جو مارکسی تصورات سے آگے بھی دیکھنا چاہتی ہے۔"

پروفیسر اعجاز علی ارشد کی کتاب سید عاشور کاظمی فن کار اور فن اور ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی عاشور کاظمی دانشور اور محرک بھی اس کا ثبوت ہیں کہ عاشور کاظمی کی خدمات کا دائرہ یقیناً بہت وسیع ہے۔

ہریانہ کے تخلیقی منظرنامے کی تابانی اور درخشندگی میں موجودہ دور میں جو چند نام شامل ہیں ان میں مشہور افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر اور مشہور مزاحیہ شاعر ٹی این راز کے نام بھی ہیں۔ کشمیری لال ذاکر تو انگوٹھے کا نشان، تین چہرے ایک سوال، ایک شہر ایک محبوب، کرماں والی، آدھے چاند کی رات، بکھرا ہوئی ایک رات، ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کے حوالے سے عالمی ادبی منظرنامے پر اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ وہیں شیشہ بدن خواب، اور عکس رخ گل بدن جیسے شعری مجموعے سے بھی ان کی شاعرانہ شناخت قائم ہوئی ہے۔ ان کے اشعار ان کی جودت فکر و اظہار کا ثبوت ہیں۔



میکدہ، چاند، چمن کوئی مہکتا سا بدن
ہم سے دیوانوں کے ایسے ہی ٹھکانے ہوں گے
دیوانگی کا درد کہاں جانتے ہیں لوگ
میں تیرا نام لوں تو برا مانتے ہیں لوگ
جانے رات کو کب دروازہ کھل جائے
تری گلی سے خواب گزرتے رہتے ہیں
میر سے روز تو نہیں ملتے
ہاں، ملاقات کرتے رہتے ہیں
مے کدے کی اداس شاموں میں
حسن کی بات کرتے رہتے ہیں

کشمیری لال ذاکر نے اپنی کہانیوں اور شاعری میں جہاں اپنی انفرادیت کے نقوش مرتسم کیے ہیں وہیں ٹی این راز (ترلوکی ناتھ کا موج) نے اپنے مزاحیہ اور طنزیہ اشعار سے الگ شناخت قائم کی ہے۔ درگت میں غالب کی زمینوں میں انہوں نے مزاحیہ غزلیں کہی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے غالب کا کلام پنجابی اور ہندی میں منتقل کیا ہے۔ احمد فراز، پروین شاکر اور منور رانا کی شاعری کو پنجابی زبان میں پیش کر کے انہوں نے ایک نہایت وقیع کام کیا ہے۔

ان کی تازہ کتاب اردو کی مزاحیہ شاعری کا انتخاب، ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ مزاحیہ شاعری کی حیثیت سے ٹی این راز اردو کے سنجیدہ اور معتبر رسالوں میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ غالب کی زمین میں ان کی مزاحیہ شاعری کا یہ رنگ دیکھیے:

ان گنت خط دے کے بولا یہ ڈاکیہ
اک پیغام زبانی اور ہے
مرغ بریانہ سبھی کچھ ہے پسند
پیٹ میں ہو گیس تو پھر کھائیں کیا
رام تیری گنگا میلی ہو گئی
مردے گنگا جل سے اب نہلائیں کیا
منصف ہے کون کیسی عدالت کہاں کا بچ
قاتل بھی کہہ رہا ہے کہ قاتل نہیں رہا

اسی سرزمین سے جاوید وششٹ جیسی شخصیت کا بھی تعلق ہے جنہیں دکنیات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ملا وجہی اور سب رس کے حوالے سے ان کا تحقیقی اور تنقیدی کام قابل قدر ہے۔ شعلہ تشنگی ان کا مجموعہ کلام ہے اور انشائیہ پکچی ان کی مشہور کتاب ہے۔

مصور سبزواری کا وطنی رشتہ گو کہ سنبھل سے تھا مگر ان کے تخلیقی موسموں کی بہار میں ہریانہ کا بھی حصہ رہا ہے۔ مظفر حسین نقوی سنبھلی یعنی مصور سبزواری، نوح میں عرصے تک مقیم رہے۔ ان کے شعری مجموعے برگ آتش سوار، دھمال، دہلیز پر اترتی شام، ماچس، ڈھیرے ڈھیرے چل ان کی تخلیقی انفرادیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے، ان کا ناول ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ بہت ہی مختلف تھا اور اس میں جدیدیت کے مثبت عناصر بھی تھے۔ ان کے یہ اشعار ان کے نظام احساس و اظہار کی جہتوں کو روشن کرتے ہیں:

رات ڈھلتے ہی کچھ احساس زیاں مجھ کو ہوا
راکھ کے ڈھیر میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا وہ بھی
جلا وطن ہوا جب نکہتوں کا شہزادہ
سبھی پہ روٹھی ہوئی خوشبوئیں حرام ہوئیں

شمس الرحمان فاروقی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اجاڑ اور خوفناک مناظر کے تاثرات کا اظہار مصور کے یہاں ایک نئے ڈھنگ سے ہوا ہے۔ اسے منیر نیازی کا اتباع نہیں کہہ سکتے بلکہ اس میں انفرادی جہت نظر آتی ہے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت نے مصور سبزواری کی تخلیقی روح تک رسائی حاصل کرتے ہوئے ان کی شاعری میں جو نکتے تلاش کیے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ اور مصور کی تخلیقی تفہیم کا معتبر حوالہ بھی۔ انہوں نے اپنی کتاب نئے تنقیدی مسائل اور امکانات، میں لفظوں کی خوشبو کا شاعر، عنوان سے یہ لکھا ہے کہ مصور سبزواری نے جو طرح طرح کے شعری پیکر تراشے ہیں وہ خشک اور بے جان نہیں بلکہ اپنے اندر زندگی کی علامتوں کی بے پناہ خوشبو رکھتے ہیں۔ ان پیکروں کے زاویے الگ الگ ہیں لیکن سب کا اشارہ ایک طرف ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت قطب نما (Pointer) کی ہے جو ایک ہی نجم القطب (Pole Star) کی جانب رخ کیے ہوئے ہیں۔ وہ نجم القطب ہے، موجودہ حیات کا درد و کرب و اضطراب اسی کرب و اضطراب کو مصور سبزواری نے مختلف زاویوں سے دیکھنے، دکھانے اور سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چاہے وہ سینے میں سانسوں کو نیش عقرب کی حیثیت سے دیکھ رہے ہوں یا آنگن میں بریدہ سروں کو بو کر کاشت کاری کا ایک نیا تجربہ کر رہے ہوں، آندھیوں میں برکتوں کے ہاتھ کے جھڑنے کا نظارہ کر رہے ہوں یا سرسبز موسم میں مخل ہوں کو خون میں لتھڑے ہوئے محسوس کر رہے ہوں ہر جگہ ہمیں ایک ہی کیفیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے وہ ہے موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہم سب کا المیہ، جدید انسان کا المیہ، جو تمام جغرافیائی حدود سے ماورا ایک شخصی المیہ ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے۔"

مصور سبزواری کے کچھ اشعار سے اس کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

مرا تمام تعلق گزرتی شب سے تھا
میں کٹا ہوا منظر سحر میں سب سے تھا
دہلیز کا بھی آخری پتھر اکھڑ گیا
لوٹے ہو اب مکینو کہ جب گھر اجڑ گیا
درخت چھاؤں زمینوں کی برکتیں بھی گئیں
سروں سے اپنے وہ گرتی ہوئی چھتیں بھی گئیں
ہر دکان اپنے کھلونوں میں سمٹ جاتی ہے
بھرے بازار سے تنہائی کی بو آتی ہے
ناگفتہ لفظوں کی خوشبو پھیل گئی
چہرہ اور آواز سے رشتہ ختم ہوا

مصور سبزواری کی شاعری میں ناگفتہ لفظوں کی خوشبو ہر حساس اور دراک ذہن محسوس کر سکتا ہے۔

(جاری)

اردو نصاب اور مدارس

گزشتہ سے پیوستہ



ڈاکٹر توقیر راہی



ان ملحوظات کے پیشِ نظر اردو زبان وادب کی تدریس کے مقاصد مدرسوں میں کچھ یوں بیان کیے جاسکتے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی یہ وہ مقاصد ہیں جنھیں تعلیم کی تمام منزلوں پر سامنے رکھے جاسکتے ہیں۔یہ مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ طلبہ میں اس بات کا احساس پیدا کرنا کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔یا ثانوی زبان ہے اور اس رشتہ سے انھیں اپنی مادری زبان سے محبت ہے۔ثانوی زبان پر اہل زبان جیسا عبور حاصل کرنا ہے۔

۲۔ طلبہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ زبان کے عملی پہلو یعنی بولنے اور لکھنے اور اس کے پہلو یعنی پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل کرسکیں،اور اظہار مطالب کے لیے زبان کو صحت،صفائی،سلاست اور شائستگی کے ساتھ تقریر وتحریر میں استعمال کرسکیں،ساتھ ہی اپنی نجی اور کاروباری زندگی میں استفادہ کرسکیں۔

۳۔ طلبہ میں مطالعے کی ایسی عادت پیدا کرنا کہ وہ اردو ادبیات سے شغف پیدا کرسکیں۔اچھے اور برے ادب میں تمیز پیدا کرسکیں۔معیاری اور غیر معیاری ادب کا فرق جان سکیں۔اچھے ادب کے مطالعے سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کا عرفان حاصل کرسکیں اور بہ حیثیت مجموعی زبان کی قوت حسن اور اثر کا احساس پیدا کرسکیں۔

۴۔ طلبہ کو اصناف سخن اور نمائندہ اسالیب بیان سے پورے طور پر واقف کرانا اور اس بات کے لیے ان میں جذبہ بیدار کرنا کہ وہ اردو ادب کے مشاہیر کے مطالعے سے استفادہ کرکے خود بھی کوئی اسلوب بیان اختیار کرنے کی اہلیت پیدا کرسکیں۔

۵۔ اردو زبان کی ابتدا،اس کی نشوونما اور ترقی کے مختلف مدارج سے طلبہ کو واقف کرانا۔

۶۔ طلبہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ زبان وادب کے ذریعے اپنے خیالات،جذبات،احساسات اور وجدان کی تربیت کرسکیں۔اپنی ذہنی قوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاسکیں اور شعروادب کی ان قدروں سے سچی محبت کرسکیں جن سے انسانی زندگی عبارت ہے۔

۷۔ زبان کی تعلیم کا مقصد محض زبان پر قدرت حاصل کرنا یا عبور حاصل کرنا نہیں ہے،بلکہ طلبہ کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنا بھی ہے تاکہ وہ لسانی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل کو بھی وسیع تناظر میں دیکھ سکیں۔زندگی کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان مسائل کا حل تلاش کرسکیں،نیز ایسے علوم اور رویے سیکھ سکیں جو سماجی تجربے میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۸۔ اردو چونکہ ہندوستان کی مخلوط تہذیب اور زندگی کی آئینہ دار ہے اس لیے طلبہ میں اس مشترکہ تہذیب کی قدروں کا احساس کرانا بھی تدریس ادب کا اہم مقصد ہونا چاہیے۔

۹۔ قواعد زبان کا مطالعہ کرانا تاکہ طلبہ صرفی ونحوی امور کی باقاعدہ تربیت حاصل کرسکیں۔

۱۰۔ طلبہ میں شعروادب کے تفصیلی اور عمیق مطالعے کے شوق کو اس انداز سے بیدار کرنا کہ وہ زبان وادب کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب،اور تنقید وتبصرے کی بھی لیاقت اپنے اندر پیدا کرلیں۔

۱۱۔ طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو تصوراتی پیکر میں ڈھال سکیں۔

مقاصد کا تعین کرتے وقت تعلیم کی ہر منزل کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔یعنی پرائمری،مڈل،ثانوی،اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ درجات،تاکہ ہر منزل پر حصول مقصد کے ساتھ ساتھ نصاب کا تسلسل بھی قائم رہ سکے۔اور یہ مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔

پرائمری منزل پر اردو تدریس کے مقاصد بیان کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کئی اعتبار سے یہ منزل بہت اہمیت کی حامل ہے۔اول یہ کہ بنیادی منزل اور اس منزل پر جو لسانی عادتیں پیدا کی جائیں گی وہ بہت راسخ ہوں گی۔دوم یہ کہ شخصیت کی نشوونما کی یہ ایک اہم منزل ہے۔یعنی جذبات،خیالات،احساسات اور رجحانات کی نشوونما کے معاملے میں اس منزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ان باتوں کے پیش نظر پرائمری منزل پر اردو کی تدریس کے مقاصد ماہرین تعلیم نے کچھ اس طرح بیان کیے ہیں:

۱۔بولنا سیکھانا: اس منزل پر بولنا سکھانے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بغیر شرم وجھجک اور بغیر کسی تکلف کے بچے فطری انداز میں بات چیت کرسکے۔استاد کو بہرحال یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بچوں کے لب ولہجہ اور تلفظ پر ان کے اپنے طبقاتی اور مقامی اثرات نمایاں ہوتے ہیں،لہٰذا ان سے ٹکسالی زبان کی توقع یا مطالبہ کرنا مناسب نہ ہوگا،ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ اپنے انداز میں بے روک ٹوک اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔اور رفتہ رفتہ انھیں بہتر بولنے کی تربیت دی جائے۔بہتر بولنے میں صحت ادائیگی،روانی اور شائستگی شامل ہے۔بولنے اور سننے کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔مدرسے کے ابتدائی درجوں میں بولنے اور سننے کی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ درج ذیل صلاحیتوں اور مہارتوں پر زور دیا جائے۔

- تقریری آوازوں پر قدرت حاصل کرانا۔
- بولتے وقت الفاظ کی صحیح ادائیگی کی صلاحیت پیدا کرانا۔
- صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق کرانا۔
- آہنگ اور لہجے پر قدرت حاصل کرانا۔
- سامعین کی ضروریات اور دلچسپیوں کے پیش نظر فطری انداز سے بولنے کی عادت ڈالنا۔

۲۔پڑھنا سکھانا: اس منزل پر پڑھنا سکھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پڑھائی کی بنیادی مہارتیں پیدا کردی جائیں۔یعنی طلبہ عبارت کو اعراب،تلفظ اور ادائیگی کے لحاظ سے صحیح صحیح پڑھ سکیں۔اس طرح کہ وہ خود اور سننے والے عبارت کا مفہوم سمجھ سکیں۔پڑھنے میں روانی ہو،لب ولہجہ مناسب ہو اور رفتار موزوں ہو۔پڑھائی عام طور پر دو قسم کی ہوتی ہے___(۱) بلند آواز کے ساتھ (۲) اور خاموشی کے ساتھ۔اول الذکر میں زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ طلبہ صحت الفاظ،لحن اور روانی کے ساتھ عبارت پڑھ سکیں،اور آخر الذکر کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ نفس مضمون کی تفہیم کرسکیں،اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں،ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کرسکیں اور جملوں کی ساخت اور ان کی مختلف شکلوں کی شناخت کرسکیں۔

۳۔لکھنا سکھانا: ابتدائی منزل پر لکھنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مشاہدات،خیالات اور احساسات کو صحت اور صفائی کے ساتھ تحریر کرسکیں۔لکھنا سکھاتے وقت عام طور پر فن کی باریکیوں پر اتنی توجہ دی جاتی ہے کہ طلبہ میں بے کیفی پیدا ہوجاتی ہے۔لہٰذا شروع کے برسوں میں بس اس بات پر زور دینا چاہیے کہ طلبہ جو کچھ لکھنا چاہیں صفائی،سادگی اور روانی کے ساتھ لکھ سکیں۔صحت زبان اور فن تحریر کی جزئیات پر بعد میں توجہ دینا مناسب ہوگا۔

۴۔سمجھنا سکھانا: طلبہ میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ گفتگو کو سن کر اور عبارت کو پڑھ کر نفس مضمون اخذ کرسکیں نیز فہم وادراک اور حافظے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔اس طرح ابتدائی منزل کے طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی میکانگی مہارتوں پر قدرت حاصل کرچکے ہوں گے اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوچکی ہوگی کہ جو کچھ کہنا چاہیں صفائی کے ساتھ کہہ سکیں اور جو کچھ لکھنا چاہیں صفائی کے ساتھ لکھ سکیں۔ساتھ ہی ہلکی پھلکی بیانیہ نظمیں لطف اور تاثر کے ساتھ پڑھ سکیں۔

جہاں تک مڈل منزل کا سوال ہے تو اس منزل پر میکانگی مہارتوں کی مشق جاری رہنی چاہیے لیکن یہاں نیم میکانگی مہارتوں پر یعنی محسوسات،مشاہدات اور تخیلات کی نشوونما پر خصوصیت سے زور دینا چاہیے۔اس منزل پر طلبہ کو چونکہ ادب سے متعارف کرایا جاتا ہے۔اس لیے مقاصد کے تعین میں وسعت اور تنوع کا خاص طور سے لحاظ رکھنا ضروری ہے۔اس منزل پر تدریس اردو کے مقاصد حسب ذیل بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ طلبہ میں سننے پڑھنے اور سمجھنے کی ایسی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ گفتگو سن کر اور عبارت پڑھ کر مطلب اخذ کرسکیں۔ان میں اس منزل پر حصول معلومات اور لطف کے لیے آزاد مطالعے کی صلاحیت پیدا ہوجانی چاہیے۔

۲۔ تقریر وتحریر کی بنیادی مہارتوں پر ایسی قدرت حاصل کرانا کہ وہ زبان کو صحت،صفائی اور شائستگی کے ساتھ تحریر وتقریر میں استعمال کرسکیں۔نیز اپنے خیالات کو مرتب شکل میں پیش کرسکیں۔ساتھ ہی اپنی ذہنی اپج اور خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔

۳۔ طلبہ کو مختلف اصناف ادب سے روشناس کرانا تاکہ وہ نظم ونثر،کہانی وانشا،خطوط،مکالمے اور سفرنامے وغیرہ سنا کر زبان کا لطف حاصل کرسکیں۔

۴۔ طلبہ کو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق معلومات بہم پہنچانا اور پیشہ ورانہ امور میں انھیں استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۵۔ طلبہ میں شعروادب کے ذریعے فطرت اور زندگی کا احتساس کرانا۔

ثانوی منزل پر پہنچتے پہنچتے طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی میکانگی اور نیم میکانگی مہارتوں پر قدرت حاصل کرچکے ہیں۔یعنی سمجھنے،پڑھنے اور لکھنے کے ساتھ اس بات کی بھی صلاحیت پیدا کرچکے ہیں کہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو تصوراتی پیکر میں ڈھال سکیں۔جہاں تک ادبیات سے شغف پیدا کرنے کا تعلق ہے،اس منزل پر طلبہ مختلف اصناف سخن سے متعارف ہوچکے ہوتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوچکی ہوتی ہے کہ زبان کے حسن سے لطف اندوز ہوسکیں،لب ولہجے کی تبدیلی سے مفہوم کی تبدیلی کو پہچان سکیں اور لوک کہانیوں اور لوک گیتوں کو پڑھ کر اور سمجھ کر لطف وحظ حاصل کرسکیں۔اس منزل پر تدریس اردو کے مقاصد مختصراً یوں بیان کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ طلبہ میں سن کر اور پڑھ کر تفہیم اور اخذ وقبول کی صلاحیت پیدا کرانا تاکہ وہ تقریری وتحریری اظہار کے وسیلوں سے استفادہ کرسکیں۔اظہار ذات اور اظہار خیالات کی نشوونما کرسکیں اور نظم ونثر کے مطالعے سے افہام وتفہیم میں گہرائی وگیرائی پیدا کرسکیں۔

۲۔ تلفظ،مطلب اور ساخت کے نقطۂ نظر سے الفاظ کے فرق کو سمجھنا تاکہ طلبہ زبان کے لسانی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرسکیں نیز زبان کا تجزیہ کرسکیں۔

۳۔ طلبہ میں حصول معلومات اور لطف اندوزی کے لیے مطالعے کی عادت میں استحکام پیدا کرانا اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احتساس کرانا۔

۴۔ طلبہ میں جمالیاتی،تخیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما کرانا۔

۵۔ طلبہ میں منطقی اور استدلالی فکر کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۶۔ طلبہ کو مشاہیر ادب کے تخلیقی کارناموں سے واقف کرانا اور انھیں اس بات کے لیے ترغیب دینا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق خود بھی ادبی اسلوب اختیار کرسکیں۔

اب منزل آتی ہے اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ درجات کی،ان منزلوں پر طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعروادب کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔زبان وادب کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب اور تنقید وتبصرے کا بھی احاطہ کریں گے،اور قواعد زبان کا مطالعہ کرکے زبان کے صرفی ونحوی امور کی باضابطہ تربیت حاصل کریں گے۔لہٰذا ان منزلوں پر طلبہ کی نظر میں ایسی وسعت پیدا کردینی چاہیے کہ وہ شعروادب کے حسن وقبح میں تمیز کرسکیں،مصنف کے نقطۂ نظر سے اتفاق یا اختلاف کرسکیں۔سماج،فطرت اور زندگی سے متعلق صحت مند رویے پیدا کرسکیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے حامل ہوسکیں۔اس کے علاوہ ان منزلوں پر طلبہ میں تحریری وتقریری انشا کی ایسی صلاحیت پیدا کردینی چاہیے کہ ان کے تخلیقی جوہر بروئے کار آسکیں اور وہ اپنے جداگانہ اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکیں۔

مذکورہ بالا مقاصد کا حصول تمام منزلوں پر اسی وقت ممکن ہے جب مدارس کے اساتذہ اردو زبان وادب کا شعور،ادب کے لسانی وادبی کردار سے آشنائی اور جدید تدریس سے گہری واقفیت رکھتے ہوں جس کا فقدان جابجا محسوس ہوتا ہے۔چونکہ محض درسی کتب کے مطالعے،روایتی اور قدیم طریقۂ تدریس اور طریقۂ امتحان نیز غیر منظم اور غیر واضح مقاصد کے تعین سے طلبہ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

مقاصد کے تعین کے بعد اب مدارس میں اردو نثر،نظم،انشا اور گرامر کی تدریس پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔ **(جاری)**



علامہ اعجاز فرخ

سفر ہے شرط

یہ لکھنؤ کی سرزمیں

گزشتہ سے پیوستہ



حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

حسین آباد سے نکلتے ہوئے مرزا نے گھوڑے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "خاص چلیے، حضور شہر کی سیر کریں گے۔" یہ بات عجیب تھی کہ مرزا گھوڑے کو چابک نہیں لگاتے تھے بلکہ کبھی کبھی بے خیالی میں اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ گویا گھوڑا ان کا ہمدم و ہمساز ہو۔ جب گاڑی چل پڑی تو مرزا جی نے کہا "آپ پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے ہیں لیکن میں یہ عرض کروں کہ آپ بار بار لکھنؤ آئیں گے۔ یہ لکھنؤ کی تاثیر ہے کہ جو ایک بار لکھنؤ آتا ہے وہ بار بار لکھنؤ آتا ہے۔ یہاں تو وہ مثل صادق آتی ہے 'ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے'۔ حیدرآباد بھی تو نوابوں کا شہر ہے، وہاں کی تہذیب، عمارتیں، رہن سہن، وہاں بھی تو یہی ہوتا ہوگا کہ جس نے حیدرآباد دیکھا ہو اسے بار بار دیکھنے کی خواہش ہوگی۔" میں نے کہا "نہیں مرزا جی! جس نے حیدرآباد ایک بار دیکھا وہ دوسری بار حیدرآباد نہیں آتا۔" مرزا نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے کہا "وہ حیدرآباد میں بس جاتا ہے ہمیشہ کے لیے۔ اسے اپنے وطن کی یاد آتی ہے لیکن حیدرآباد چھوٹے نہیں چھوٹتا۔ حیدرآباد مروت کا شہر ہے، محبت میں آباد ہوا، محبت سے آباد کیا گیا۔ اس کی سوندھی مٹی میں محبت کی خوشبو ہے اسی لیے وہاں مٹی کا عطر بھی کشید کیا جاتا ہے۔ سوندھی مٹی کا وہ عطر، جیسے تپتی ہوئی زمین بارش کی پہلی بوند کے ساتھ مہک اٹھتی ہے۔ جیسے کوری صراحی میں بسے پانی کے پہلے گھونٹ کی خوشبو۔ جیسے شب فراق میں کسی کی یاد کی مہک۔ جیسے کسی برہن کو ساجن کا پیرہن مل جائے اور وہ اس سے لپٹ جائے۔" مرزا نے بے ساختہ گھوڑے کی راس کھینچ لی اور مجھے تکنے لگے۔ میں نے آہستہ سے کہا "شمامۃ العنبر اور عطر حنا تو لکھنؤ کے عطاروں نے کشید کیا لیکن حیدرآباد کا عطر 'باسی دلہن' کہلاتا ہے۔ کنوار پن جب حنا، اگر، موتیا اور گلاب کی لپٹوں میں ملفوف کسی کی بانہوں میں سمٹ جائے اور شب وصال کے بعد دوشیزگی یوں نکھر آئے کہ آئینے میں اپنے آپ سے شرما جائے تو اس خوشبو کو حیدرآباد میں 'باسی دلہن' کہا جاتا ہے۔" مرزا مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں میری آنکھوں میں کوئی خواب تلاش کر رہی تھیں۔ شاید کسی چلمن کی ٹوٹی ہوئی تیلی، کسی دوپٹے کا رنگ، کسی پیرہن کی خوشبو کا خواب۔ جوان رات کے سینے پر مچلتے ہوئے آنچل کی لہروں کا خواب۔ لیکن جب تک آنکھوں میں خواب کی تعبیر نہیں اترتی، خواب کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ بے رنگ خواب اوس کی طرح ہوتے ہیں۔ آنکھوں کو بھگوتے ضرور ہیں لیکن خواب کا کوئی رنگ آنکھوں میں نہیں چھوڑتے۔ مرزا کو شاید اوس دکھائی دی نہ کہری دھند۔ انھوں نے گھوڑے سے کہا "چلیے بھی کیا کھڑا اینڈ رہا ہے" اور اس کی راس ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑا اپنی نپی تلی چال چل رہا تھا، مرزا خاموش تھے۔ ایسے لگتا تھا گاڑی تو راستے پر سفر کر رہی ہے لیکن مرزا کسی اور جہاں میں گم ہیں۔ جیسے خواب کے کسی رنگ نے چھاپ لیا ہو، کسی ایسی رات کا رنگ اور خوشبو جسے کسی نے دن بنا دیا تھا۔

اس وقت میری عمر اٹھارہ برس تھی۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شہر صرف زمینوں پر نہیں ہوتے۔ شہر تو ذات میں ہوتے ہیں۔ شہر خیال، شہر آرزو، شہر تمنا۔ آدمی اپنے شہر ذات کی جھلک زمین پر آباد شہروں میں تلاش کرتا ہے۔ اپنے اندر کی زمین کو زمینوں پر ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ کوئی اجنبی، ان دیکھی زمین مل جاتی ہے تو اس میں سیر کرتا ہے۔ کہساروں کی، میدانوں کی، صحراؤں کی، بیابانوں کی، وادیوں کی، کبھی تاریک وادیوں کی، کبھی روشن صاف ستھری سپاٹ سطح زمینوں کی، چشموں کی، دریاؤں کی، جھیلوں کی۔ کبھی سیر کرنے کی تمنا میں کبھی ان جھیلوں میں ڈوب جانے کی آرزو میں اور پھر جب اس زمین کو سر کر لیتا ہے تو نئی زمین کا انتظار۔ یہی سیاحت ہے، شوق سیاحت بھی، ذوق سیاحت بھی۔ کولمبس کو خود خبر نہیں ہوتی کہ اس کے پاؤں کی زمین کبھی شہر بن جاتی ہے، کبھی ملک۔ کبھی تہذیب کبھی تمدن سماں۔

تانگہ رکا تو مرزا جی نے ایک بلند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ اکبری دروازہ ہے۔ کبھی اس کی بہار دیدنی تھی اور یہیں چاول والی گلی سے نخاس شروع ہوتا تھا۔ انگریزوں نے ترکاری منڈی سے شروع ہونے والی اس سڑک کو ملکہ وکٹوریہ کے نام سے معنون کیا تھا اور یہ سڑک وکٹوریہ اسٹریٹ کہلاتی تھی۔ زندگی کی مانگ کی طرح سیدھی گئی ہے۔ ملیح آباد کے انقلابی شاعر جوش نے اسے لکھنؤ کی مانگ بھی کہا ہے۔ لکھنؤ والے اس سڑک کے درمیانی حصے کو کوریہ گنج کے بجائے کٹوریہ گنج بھی کہتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ جنھیں لکھنؤ کے لوگ محبت سے 'جان عالم' بھی کہا کرتے تھے، ان ہی کے دور سے یہ بازار رہا ہے۔ دور دراز کے علاقوں سے لوگ یہاں آ کر اپنا کاروبار کیا کرتے تھے۔ دنیا بھر کا کپڑا، سوت، ریشم، ململ، مخمل، اون، مشجر، کمخواب، زربفت، کامدانی، زردوزی، ہمرو اور ڈھاکے کی ململ تو ایسی کہ اگر گھاس پر ہو تو اوس کی چادری جان پڑے۔ بزاز، جلاہے، جوہری، ساہوکار، کسیرے، مسی گر، سنار، حکاک، ملمع ساز، رفوگر، رنگریز، چھاپہ گر، مصور، رنداف، پھول والے، تنبولی، عطار، نجار، لوہار، قلعی گر، کنجڑے، قصائی، ایسے ماہرین فن اور کاریگر شاید ہی کہیں اور پائے جائیں۔ ساہوکار اور سنار تو زیور بناتے ہی ہیں پر حکاک نگینے تراشتے تھے یوں کہ تاج شاہی کو آب ہو، کوئی نگینہ زیور میں جڑے اور زیور چاہے کہ دستار کی زینت ہو یا گلے کا ہار ہو جائے۔ کسیرے تو دھات کے برتن بناتے پر ایسے کہ دیکھنے والی نظر دیکھتی حیراں ہو جائے۔ مرزا اپنی رو میں تھے اور میں خاموش انھیں سن رہا تھا۔ نداف پاؤ بھر روئی سے رضائی ولائی تیار کر دے۔ سچ کہوں حضور! پھولوں کی چادر بھی اتنی سبک نہ ہوتی ہوگی مگر وہ بدسے لکھنؤ کے نداف انھیں بھلا پھولوں کے وزن سے کیا لینا۔ ان کے پیش نظر تو پھول بن اور پھول بدن ہوا کرتے تھے کہ رضائی کے بوجھ سے برگ گل کی نزاکت کو ٹھیس نہ پہنچے اور سردی آتش گل کو ماند نہ کر پائے۔ رہی بات عطاری کی تو احمد حسین محمد حسین، اصغر علی محمد علی جیسے عطار کا ہے کو کہیں پائے جائیں۔ لکھنؤ قدر دانوں کا شہر ہے، ایک عطر پر کیا موقوف ہے تمباکو خمیرہ، زردہ، ہر ایک کا ذوق الگ، پسند الگ، خوشبو الگ۔ نواب صاحب کے خمیرے کی خوشبو اور بیگم صاحبہ کے حقے کی مہک اور۔ لکھنؤ میں آداب، تسلیم، بندگی، سلام، قدم بوسی، مجرا تو ہے ہی لیکن عطر، پان، شربت بھی اپنی زبان اور معنی الگ رکھتے ہیں۔ مہمان کے استقبال پر پان کا طریقہ اور رخصت پر پان کا سلیقہ اور۔ اس پر طرفہ گلوری کی نزاکت، پیش کش اور آداب تو قیامت ہے قیامت۔ لکھنؤ کا پان تو نفاست اور نزاکت میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ غریب ہو یا امیر تنبولی سے پان لے کر راستے میں جانوروں کی طرح جگالی کرنے سے عار ہے۔ تو لڑکے کو جوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی پان کھائیں تو وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بزرگ دیکھ نہ لے اور پان کھائے کسی بزرگ کے سامنے ہونا بے ادبی تھا۔ جیسا گھرانہ اور خاندان، بیگم صاحبہ کا ویسا ہی پاندان۔ یوں بھی بیگم صاحبہ کے رتبے اور مرتبے کا اندازہ ان کے پاندان کے خرچ ہی سے ہوا کرتا۔ لکھنؤ میں پان کی کاشت نہیں ہوتی۔ یہاں پان بنارس سے، کلکتے سے یا بھوپال سے آتے ہیں۔ کلی دار چونا، عرق گلاب یا کیوڑے میں بھگو کر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر مہین ململ میں چھان کر اسے جمالیا جاتا ہے۔ کتھا تو خیر کانپور یا بریلی کا، دل لکھنؤ کو پسند ہے۔ شیر بادام میں پکایا ہوا، جو زردہ و قوام پسند ہوا تو کانپوری کتھا، اور جو پسند خاطر نہ ہوا تو بریلوی کتھا۔ پرت پرت ترشی ہوئی چھالیہ، چکنی سپاری، بڑیل، الائچی، سونف، لونگ، جز، جوتری، دارچینی، مہین تراشا ہوا کھوپرا، زعفران، گل قند، مشک، چاندی سونے کے ورق۔ ہر ایک کا توازن الگ۔ انگلیوں کی نزاکت اور معاف فرمایے، چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ بیگم صاحبہ کے پان بنانے کا سلیقہ تو کچھ یوں ہوا کرتا ہے کہ پہلے سرخ صافی زانو پر ڈال کر پان کو صاف کر لیا اور پھر انگلیوں سے ساری نسیں چھیل دیں کہ سخت ریشہ نہ رہے، پھر چونا اور اس پر کتھا لگا کر دونوں کو ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ رنگت نکھر آئی تو حسب ذوق وذائقہ اس میں قوام اور زردہ کی آمیزش کرتی۔ باریک ململ کو صوف جیسی کاٹ کر لا کچیاں اس میں لپیٹ دیں اور صراحی کے سرخ کپڑے پر رکھ کر اس پر اپنے ہاتھ سے آب سرد کا چھڑکاؤ کر دیا کہ رات بھر میں بھیگ جائیں۔ پان بناتے ہوئے ڈھکیل کر ایک ایک دانہ الگ کرکے ہتھیلی میں رکھ کر پکھلیا اور چاندی کے ورق میں لپیٹ کر موتی بنا لیے، تب کہیں وہ پان کے قابل ہوئی۔ حسب ذوق وذائقہ اس میں مصالحہ اضافہ کیا گیا۔ جو گرما کا موسم ہوا تو زعفران اور جو گر جاڑے ہوئے اور طبیعت موافق پائی تو مشک کا ٹکڑا۔ بڑی نفاست اور نزاکت سے حنائی انگلیوں نے گلوری لپیٹی اور سونے چاندی کا ورق لپیٹ کر اس میں چاندی کا لونگ جڑ دیا۔ چاندی کے حلقے میں نفیس اور نازک زنجیر ہوا کرتی ہیں، کسی میں سات تو کسی میں نو۔ ان کے دوسرے سرے پر چاندی کے لونگ بنے ہوتے ہیں جو جڑے جاتے ہیں اور یہ گلوریوں کا گلدستہ چاندی کے خاصدان میں سرخ صافی میں لپیٹ کر حضور نواب صاحب کی خدمت میں پہنچایا جاتا ہے۔ اس اہتمام سے کہ اس کی خوشبو تک نہ کوئی مشام پہنچنے پاتی۔ پھر نواب صاحب نے خاص دان کھول کر گلوری نکالی اور سانس کھنچی کھنچی رہ گئی۔ زردہ، قوام، مشک، زعفران کی خوشبو تو ہے ہی لیکن حنائی انگلیوں کی خوشبو تو گلوری کی نس نس میں بسی ہوتی۔

"لیکن حضور!" یہ کہہ کر مرزا جی رک گئے، دیر ہوگئی، کچھ کہا نہیں بس خلا میں تکتے رہ گئے۔

میں نے کہا "مرزا جی! کہاں کھو گئے آپ۔"

کہا "حضور کیسے کہیں، آپ تو عمر میں بہت جوان ہیں، مجھے وہ بات زیب نہیں دیتی۔"

میں نے کہا "مرزا جی! پان تو پان ہے، کوئی شراب تھوڑی ہے۔ نہ حرام ہے نہ گناہ۔ اس میں کوئی حسن گستری والی بات آ پڑی؟"

"درست فرمایا حضور نے، پان نہ حرام ہے نہ گناہ۔ انسان کسی صورت حرام کو حلال نہیں قرار دے سکتا لیکن اسے کیا کیجیے کہ قدم بہکے جاوے اور ہر میں ٹھہر ہی جاتا ہے۔ چلیے کوئی گستاخی ہو تو کہہ لیتا ہوں۔" پھر نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا "بیگم کا پان اور ہے، ڈومنی کا پان اور۔ ایسی نفاست اور نزاکت سے بیگم نے گلوری تیار کی کہ ہمرو کا بھی انگلیوں کی مہک کو چھونے نہ پائے۔ بیگم کا پان ایک کے لیے ہے، اپنے سرتاج خدا کے لیے۔ ڈومنی کا پان ہر ایک کے لیے ہے۔ انسان کی عجب ہے، بلند ہوتا ہے تو اتنا کہ عزت نفس کے لیے محبت میں شرکت گوارا نہیں کرتا۔ گرتا ہے تو اتنا کہ جانتے ہوئے بھی کہ رقیب کئی ہیں، عزت پیچھے چھوڑ پان ہی کے لیے پوری رات آنکھوں میں گذار دیتا ہے کہ رستے وہ ابھی ساغر و مینا مرے آگے اور ادھر انتظار میں جاگتی آنکھیں اور سلگتا ہوا بدن انتظار کشید کر رہا ہے۔

وہ آئے ہیں نہ شب انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

جو پیش بانری ساتھ آئی تھی، سر میں چنبیلی کا تیل مل رہی ہے۔ ہتھیلیاں اور تلوے سہلا رہی ہے۔ تاہلی کا ورد کر رہی ہے۔ آیت الکرسی دم کر رہی ہے اور بدن اینٹھا جا رہا ہے۔ چار و ناچار اس نے کہانی چھیڑی۔ "ایک تھا شہزادہ۔ چار دانگ عالم میں اس کی شجاعت اور مردانگی کی دھوم۔ سنہری بال، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی تاتاری ہرن جیسی آنکھیں، ستواں ناک، سرخی دہن پر عقیق یمنی کا گمان اور ہنس پڑے تو موتی جیسے دانت، گویا عدن کی ساری بضاعت یمن میں ہو۔ فراخ سینہ، جواز کی امانت سنبھال سکتا ہو اور وار سہہ کر بھی حوصلہ نہ ہارنے کی جرات رکھتا ہو۔ بھرے بھرے بازو جو شکست کو فتح میں بدلنے کی طاقت رکھتے ہوں، مضبوط کلائیاں، اور پنجہ ایسا کہ شیر کے منہ پر پڑ جائے تو زبان دانتوں سمیت باہر کو آن پڑے۔ دشمن کی کلائی چھڑانا مشکل ہو جائے۔ اور کسی سیم تن کی کلائی جھکے سے تھام لے تو بانہوں میں اسیر ہو جانے کی آرزو کرے۔" یہاں تک پہنچ کر اس نے چہرے پر نظر کی تو آنکھیں بند تھیں، بکھری زلفوں کے بیچ چہرہ پرسکون تھا، ہونٹوں پر ہلکا تبسم سا تھا۔ اس نے کہانی روک دی۔ یہ سوچ کر کہ باقی کہانی خواب میں پوری ہو جائے گی۔

رات بھر روتے روتے سارنگی سسک رہی تھی۔ ستار کے تار مضمحل تھے۔ طبلہ نڈھال سا ہو رہا تھا۔ فانوس کی لو مدھم ہوا چاہتی تھی۔ وہ بھی تھکی تھکی سی اٹھی، روبرو ہوکر پان پیش کرتے ہوئے کہا "حضور! پان۔" نواب صاحب نے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گلوری اٹھانی چاہی۔ ہاتھ انگلیوں سے مس ہو گیا۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "کل پھر آئیے گا نا! میری آنکھیں آپ کی راہ تکتی رہیں گی۔" نواب صاحب نے گلوری دہن میں رکھی اور چوگوشیہ ٹوپی کی نوک سیدھی کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔ "پان تو پان ہے حضور! بس تازہ اور باسی کا فرق ہے۔" نواب صاحب جب گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ مسہری پر آرام فرما تھیں۔ یہ بھی لیٹ گئے اور دوسرے پہلو کو کروٹ بدل لی۔ انگلیوں کو سونگھا، شاید لمس کی خوشبو جاتے ہوں اور آنکھیں بند کرلیں۔

بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں، وضو سے فارغ ہوئیں تو کنیز سلفچی اور آفتابہ لیے حاضر ہوئی۔ منہ ہاتھ دھلوائے تو فرمایا "حمام تیار کرو۔" کنیز "جی" کہہ کر الٹے قدم الٹ گئی۔ غسل فرما کر نکلیں تو کنیز نے سرخ رنگ کی صوفی نوکری کے پیچ سکھانے ہوئے گیسوؤں پر بھیگ، گرم لوبان، ہاتھ مصالحہ لگا کر صندل کا برادہ ڈال دیا کہ بال خشک کر لیں۔ بیگم صاحبہ یوں بھی صندل اور گل بنفشہ کے ابٹن سے مہک رہی تھیں۔ نہا دھو کر اور اجلی ہوئیں تو نکھر گئیں۔ دن چڑھے نواب صاحب بیدار ہوئے تو دیکھا بیگم صاحبہ سفید چاندنی بچھے تخت پر سبز قمیص غرارہ زیب تن کیے ہوئے سرخ دوپٹہ اوڑھے زانو پر سرخ صافی بچھائے پان کی نسیں چھیل رہی ہیں۔ نواب صاحب نے بیگم کو غور سے دیکھا۔ آج سج دھج ہی نرالی تھی۔ پہلو میں بیٹھ کر کہا "آج تو حضور کے انداز ہی الگ ہیں، ماشاءاللہ آپ کی ان قاتل نگاہوں کے تو ہم بسمل ہیں۔ آج تو آپ قیامت لگ رہی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ آپ کا یہ حسن جہاں سوز ہمیں خاکستر کردے۔ یقین جانیے ہمیں آتش گل سے ڈر لگتا ہے لیکن اس سے بچھڑنے اور اس سے کھیلنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔" پھر کہا

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

(جاری)

کتابیں بولتی ہیں!

تبصرہ



شکمِ مادر میں دو جڑواں بچوں کے مابین مکالمہ: پیدائش کے بعد زندگی؟

مترجم: عاصم بشیر خان
مصنف: پابلو جے لونس مولی نیرو

مَولی نیرو نے یہ کہانی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی پیدائش کے بعد لکھی تھی اور یہ ان کی کتاب، موٹو گوئی کا حصہ ہے جو 1980 میں چھپی تھی۔ یہ اردو ترجمہ ان کی اصل کہانی "لڑکا اور لڑکی" سے ماخوذ ایک مختصر تخیلاتی تحریر کا ہے۔ مکمل کہانی کے لیے ان کی کتاب کا مطالعہ کریں۔

شکمِ مادر میں دو جڑواں بچوں کے مابین مکالمہ۔

پہلا دوسرے سے، کیا تم پیدائش کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہو؟

دوسرے نے کہا، بے شک۔ پیدائش کے بعد کچھ تو ہوگا۔ ممکن ہے کی ہم یہاں اپنے مستقبل کی تیاری کے لیے ہیں۔

بکواس، پہلے نے کہا۔ پیدائش کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ کیسی زندگی ہوگی وہ؟

دوسرے نے جواباً کہا، مجھے معلوم نہیں، لیکن یہاں کے مقابلے میں زیادہ روشنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے ہم اپنے پیروں پر چل سکیں اور اپنے منھ سے کھا سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مزید حواس ہوں جن کا ہمیں ابھی ادراک نہ ہو۔

جواباً پہلے نے کہا، کتنی بے تکی بات ہے۔ چلنا پھرنا ناممکن ہے۔ اور اپنے منھ سے کھانا؟ مضحکہ خیز! آنول سے ہمیں غذا اور ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے اور آنول بہت چھوٹی ہے لہٰذا دلیل و منطق کی رو سے پیدائش کے بعد کی زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے نے اصرار کیا، میرا خیال ہے کہ وہاں کچھ تو ہے اور ممکن ہے کہ یہاں سے مختلف ہو۔ ہو سکتا ہے وہاں ہمیں اس غذا کی نالی کی ضرورت ہی نہ ہو۔

پہلے نے تعجب سے کہا، کتنی لایعنی بات، اور بالفرض وہاں زندگی ہے تو پھر وہاں سے کبھی کوئی واپس کیوں نہیں آیا؟ پیدائش دراصل زندگی کا خاتمہ ہے اور پیدائش کے بعد کچھ نہیں صرف اندھیرا، خاموشی اور ویرانہ ہے۔ پیدائش ہمیں کہیں نہیں لے جائے گی۔

ٹھیک ہے، مجھے نہیں معلوم، پر یقیناً ہم ماں سے ملیں گے اور وہ ہماری حفاظت کرے گی، دوسرے نے یقین سے کہا۔

پہلے نے اچنبھے سے کہا، ماں، کیا تم ماں پر یقین رکھتے ہو؟ قہقہہ لگاتے ہوئے، اچھا اگر ماں ہے تو وہ اس وقت کہاں ہے؟

وہ ہمارے چاروں اطراف ہے۔ اس نے ہمارا احاطہ کیا ہوا ہے۔ ہم اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ ہم اس میں رہتے ہیں۔ اس کے بنا یہ دنیا نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہی رہے گی۔

پہلے نے استدلال کیا، لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی، پس منطقی بات تو صرف اتنی ہی ہے کہ وہ موجود ہی نہیں۔

دوسرے نے جواباً کہا، جب بھی تم خاموشی اور توجہ سے دھیان لگا کر سنو تم اس کی موجودگی کو محسوس کر پاؤ گے اور تم اس کی پیار بھری آواز اوپر سے پکارتے سن پاؤ گے۔

اختر عثمان کا چراغ زار، تبصرہ کتاب: زبیل اکبر حاتق

بت پرستوں کے لیے بانہیں کھلی رہتی تھیں
اُن زمانوں میں یہ زیر و حرم ایسے نہ تھے
(چراغ زار)

یہ ہے اس عہد پرور شاعر اختر عثمان کی نئی کتاب چراغ زار کا دیباچہ شعر جس کی قلم رو میں لفظ دست بستہ ہنر آفرینی کی فریاد کرتے ہیں اور وہ انھیں جوہر تازہ کی تراش دینے کا فن جانتا ہے۔ اختر عثمان ایک ایسی یاقوت کی بستی کا شاعر ہے جو کبھی حرفِ دشنی کی دریوزہ گری پر آمادہ نہیں ہوتا چاہے اُس راہ میں اُسے بازار شہرت کی بخششیں ہی کیوں نہ کی جائیں۔ بے ہنر سے داد لینے کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتا اور بے توفیقوں سے رسم و راہ نہیں کرتا کہ ان کی گرانی اُس کی لطیف طبیعت پر گراں ہے۔ اختر عثمان کے لفظ کی بندش احساس کی روشنی میں تندہ کر روح کا مرقع بنتی ہے۔ مصرع بجست ایسا کہ نرمنڈل کے تار بجنے لگیں، الفاظ گراں قدر ایسے کہ ہیرے کی تنکی پر ترس آئے اور جنس تخیل ایسی کہ جبرئیل پرواز سے تھکے مگر بلندی تخیل پر نہ پہنچے۔ اختر عثمان کی تمام کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور میں نے انھیں دل کی محبت اور روح کی گہرائی سے پڑھا اور ذمہ داری سے اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ماسیوں کے شاعر ہی نہیں۔

اُن کی لفظ پروری کو وہ سمجھے جو میر و غالب کے شعر کا احاطہ کر چکا ہو اور انیس کے معبر معانی کو چھو چکا ہو اور لفظ کی ماہیت، جمال سے واقف ہو۔ اختر عثمان نے اس کتاب میں بھی وہ تمام ہنر آزمائے جو وہ اپنی سابقہ کتب میں آزما چکے ہیں اور وہ تمام فن اس کتاب میں سمویا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، بجا طور پر میں اُن دعاوی کا احترام کرتا ہوں اور معترف ہوں اور اُن کے لفظوں کی ہیئت، رعایت، جنس، قوت اور صنعت گری اور استعارہ سازی کا قائل ہوں۔ یہ بجا ہے کہ زمانے نے ویسے ان کی قدر نہیں کی جس کے وہ حق دار تھے مگر زمانے نے تو ہمیشہ اہلِ ہنر کی ناقدری ہی کی ہے اور عامیوں ہی کو مسند کا وارث بنایا ہے پھر اس میں اختر عثمان ہی کا رونا کیا۔ گلی گلی میں شعر گوئی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اور مشاعرے کا باجا بجانے والے کیا جانے لفظ کی توقیر کو۔ آئیں اس بزم میں بیٹھیں اور لفظ سے شناسائی پائیں۔ یہ کتاب بالاشبہ پڑھنے والی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ جس نے شعر کی حقیقت اور لفظ کی شریعت کو پانا ہے وہ اختر عثمان کی غزلوں کا ضرور مطالعہ کرے صرف اس کتاب ہی کا نہیں اس کے سارے کلام کا۔

کچھ شعر اس کتاب سے:

پھٹے پہ دامن یوسف ابھی سلامت ہے
ہنر کا پاس نہیں حضرتِ زلیخا کو
معاملہ مری آوارگی سے کون رکھے
یہ شہر کیسے رکھے گرد بادِ صحرا کو

قرن ہوئے کہ وہ دری چاپ کی پاس تک نہیں
راہ میں رکھ دیا گیا صورتِ نقشِ پا مجھے

جینے کا کم از کم تھا یہ معیار کہ تا دن
اونچا ہونے نہیں دیا نیزہ بھی سر سے

تہ بہ تہ ہم نے قرینوں سے کیے تیرے سخن
مستعاری نہ تھے ایک ایک جہت اپنی تھی

بہت سنبھال کے رکھ اے نگارِ زیست ہمیں
عجب نہیں کہ ترے کھیلنے میں کھو جائیں

ایک سیدھا سچا اور مخلص شاعر انور جمال انور

عالم نقوی

صاف ستھری، آسان، سلیس اور عام فہم زبان میں شعر کہنے والے کم سہی لیکن ابھی ہیں، مگر، انور جمال انور کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اتنے ہی سیدھے، سچے اور مخلص انسان بھی ہیں جتنے سچے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں نہ کسی طرح کا ابہام ہے نہ تکنیک۔ بس یقین ہی یقین ہے اور اس یقین کا سیدھا سچا، بے باک اور صاف ستھرا اظہار۔ اُن کی شاعری اور شخصیت کا یہی حسین امتزاج اُنھیں دوسروں سے ممتاز بناتا ہے۔

یہ اک سمت وحشت ہے یہ کس کے شہر کا منظر
نہ یہ قہر ہے زمیں نہ بلا یہ آسمانی
تھی جو حق گوئی کبھی جنس گراں انور جمال
اس کی تو بازار میں اب کوئی قیمت ہی نہیں
بچوں میں نظر آتے ہیں انداز جوانی ۔۔۔ اب ننھے نہیں
تانی سے پریوں کی کہانی! اُن کی ایک خصوصیت جو بہت جلد قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہے وہ اُن کی گرد و پیش کے حالات سے باخبری اور اس پر اُن کا فوری ردعمل ہے:

ہمیں اندھے عقیدے تابہ اندھا ہی رکھیں گے
عجب تاریک راہوں پر ہے انور قافلہ اپنا
عجب انداز ہے طوفاں کا انور
کہ رنگ اُڑنے لگا ہے ساحلوں کا
ادب کمزور پڑتا جا رہا ہے
ہوا ہے زرد چہرہ محفلوں کا
فقط تنقید ہی کرتے رہو گے؟
کوئی رستہ نکالو مشکلوں کا!

ہمارے سامنے اس وقت اُن کا تیسرا مجموعہ کلام "پرواز حیات" ہے۔ جو ابھی گزشتہ مہینے (اکتوبر ۲۰۱۷) میں شائع ہوا ہے۔ سادگی، سرداری، عصری آگہی اور بے باکی غزلوں کی طرح ان کی نظموں پر بھی حاوی ہے۔ زرخرید اور بکاؤ عصری میڈیا، جسے این ڈی ٹی وی کے شہرت یافتہ حق گو اینکر رویش کمار بجا طور پر ہانکے پکارے 'گودی میڈیا' کہتے ہیں، اور خود غرض فرقہ پرست، متعصب اور غیر روادار عصری سیاست کے خلاف کم شاعروں نے اتنی جلدی اس طرح اپنے قلم کو تلوار بنایا ہوگا جس طرح انور جمال انور نے اپنی نظم 'عصری میڈیا' میں ذرائع ابلاغ اور سیاست کو نشانہ بنایا ہے:

ہم جو چاہیں گے وہ بولی بولیں گے
اپنی سوچ سے ہم دنیا کو تولیں گے
سب کی جھولی بولی خوب ٹٹولیں گے
دل بدلو جتنے ہیں سارے اپنے ہیں
سارے چینل ہم نے مول خریدے ہیں



دیش میں اب ممانی ہم کو کرنا ہے
ہم کو تو بس اپنی جھولی بھرنا ہے
کیسی جنتا؟ جنتا سے کیا ڈرنا ہے!
ہم وہ کب ہیں، جنتا سے جو ڈرتے ہیں
سارے چینل ہم نے مول خریدے ہیں
سامپردائک ہم کو کون بتائے گا
جو بولے گا بیکار اگر میں جائے گا
جانچ کمیشن ان کو دوشی پائے گا
جو پچھڑے کچلوں کی باتیں کرتے ہیں
سارے چینل ہم نے مول خریدے ہیں
بھارت کا اتہاس مٹانا چاہے وہ
بھائی بھائی کو لڑوانا چاہے وہ
دیش کو پھر کھنڈت کروانا چاہے وہ
کھلے ہوئے اس کے ناپاک ارادے ہیں
سارے چینل اس نے مول خریدے ہیں
مسلم کا اک نام فضا میں چھوڑ دیا
پوری قوم کو آتنک واد سے جوڑ دیا
بھائی چارے کا ہر بندھن توڑ دیا
بھارت واسی لاچاری سے تکتے ہیں
سارے چینل اس نے مول خریدے ہیں
انور ان حالات کا تم غم مت کرنا
کوئی ڈسا ہو ظالم کا دم مت بھرنا
ظلم کے آگے سر اپنا خم مت کرنا
سب سے کہدو ہم اللہ کے بندے ہیں
کیا ڈر چینل اس نے مول خریدے ہیں!

اس مجموعے میں اُن کی پانچ حمد، گیارہ نعتیں، چار منقبتیں، تین سلام، پچاس غزلیں، پندرہ نظمیں اور آٹھ قطعات شامل ہیں۔ غزلوں میں نصف سے زیادہ ایسی ہیں جن کے بارے میں بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں کوئی شعر محض برائے بیت، یا بھرتی کا نہیں ہے۔

'برسات' اور 'دھوپ' اُن کے محبوب موضوعات ہیں جن کا اپنی غزلوں میں اُنھوں نے بطور ایک حسین مظہر فطرت بھی استعمال کیا ہے اور بطور استعارہ بھی:

صبح کچھ شام اس کی ہے کچھ اور
سر خوشی ہے کبھی اُداسی دھوپ
جانے کس مہر شو فشاں کی ہے
ذہن انور پہ اک شعوری دھوپ

بات پھولوں کی کیا ہے کلیوں کو
مسکرانا سکھا رہی ہے دھوپ
صبح جب مل گئی ہے سردی کی
کس قدر مسکرا رہی ہے دھوپ
دن کی سب رونقیں سمیٹے ہوئے
میرے آنگن سے جا رہی ہے دھوپ
دل میں غم مت پالیے برسات میں
میرے گھر آجایئے برسات میں
پھر انہیں سمجھایئے برسات میں
ہیں غزل کے زاویے برسات میں

ردیف 'بارشوں کے موسم میں' اُن کی پوری غزل فطرت کے حسین مظہر کا دلکش بیانیہ ہے۔ انور صاحب نے حسرت موہانی کی مشہور غزل 'نسانہ یاد ہے' اور 'ستانا یاد ہے' کی طرز پر اسی رنگ میں ردیف اور بحر میں ذرا سی تبدیلی کر کے 'زمانہ یاد آتا ہے' اور 'منانا یاد آتا ہے' نو اشعار کی جو غزل کہی ہے وہ اُن کی سادہ مزاجی اور شعری لطافت دونوں کا ثبوت ہے۔ اس کے آٹھ اشعار (ص ۲۹۔ ۴۷) تو بلاشبہ ایک ذیل ہیں!

ہمیں بچپن کا اب تک وہ زمانہ یاد آتا ہے
کسی کا روٹھ جانا پھر منانا یاد آتا ہے
کبھی پچھنگ کبھی پگڈنڈیوں پہ جھومنا گانا
کبھی کچھ کہہ کے شرمانا لجانا یاد آتا ہے
وہ روتے روتے ہنس دینا کسی کا بے سبب انور
وہ ہنستے ہنستے اشکوں کا بہانا یاد آتا ہے

انور صاحب نے (بہ حیثیت انجینئر تیل اور قدرتی گیس کمیشن ONGC میں) اپنے زمانہ ملازمت کا بڑا حصہ آسام اور گجرات میں گزارا۔ سن دو ہزار دو عیسوی کے پر آشوب زمانے میں وہ گجرات ہی میں تھے۔ اُن کی نظمیں 'سنسکاری نگری گجرات' 'باپو کی نگری میں' اور 'گجرات کا اتیت' اُسی زمانے کی یادگار ہیں۔ سنسکاری نگری میں وہ لکھتے ہیں:

گجرات ایک مرکزِ امن و امان تھا
ہر فرد کامیاب تھا اور کامران تھا
بس ایک شب میں بدلے تھے حالات اس طرح
خطرے میں ہر علاقے کا پیر و جوان تھا
سب جل گئے فساد کے شعلوں میں مرد و زن
بچی جوان تھی کوئی بیٹا جوان تھا
ظلم و ستم کی آگ سے میں بھی نہ بچ سکا
جو جل گیا فساد میں میرا مکان تھا
انور کوئی ٹھکانہ نہیں حادثات کا
جب بجلیاں گری تھیں بھلا آسمان تھا!

چونکہ او این جی سی کی سرکاری ملازمت کے دوران وہ زیادہ تر آسام اور گجرات میں رہے اور انہی کے لفظوں میں "افسروں نے جب ان میں شعر و شاعری سے محبت دیکھی۔

(باقی صفحہ 22 پر)

زندگی کی نقالی نہیں، ہمیں جینا سیکھنا ہوگا

بلال الرشید

ذائقے

ذائقے کے اعلیٰ انسانی ذوق کو بنیاد بنا کر بڑی بڑی کمپنیوں نے کھانے پینے کی ایسی مصنوعات بنائیں، جو بہت لذیذ تھیں لیکن بتدریج وہ جسم کو ناکارہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ کاربونیٹڈ سافٹ ڈرنکس ان میں سر فہرست ہیں۔ ان میں چینی کا انبار ہے۔ اصولی طور پر یہ صرف ان جانوروں کو دی جانی چاہیے تھی، جن کو جلدی موٹا کرنے کی ضرورت ہو۔ چینی، مٹھاس، ہر کیمیکلز سے بھرپور اور اپنے بنیادی ماخذ سے بہت دور۔ ایک نامور ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ کہا: جس قدر شوگر اور جتنا نمک انسانی جسم کو درکار تھا، وہ خدا نے پہلے ہی مختلف غذاؤں میں رکھ دیا تھا۔ انگور میں مٹھاس موجود ہے، انار میں ہے اور کیلے میں بھی۔ لیچی اور چیری میں ایک اور طرح کی مٹھاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ چینی اور نمک کی صورت میں ہم نے روز ہر اپنی زندگیوں میں بھر دیے۔ بڑے بڑے سپر سٹورز پر ہر قسم کے چپس، بسکٹ، نوڈلز، میدے کی دیگر مصنوعات اور سافٹ ڈرنکس کے پہاڑ موجود ہیں۔ موٹے موٹے پیٹوں اور موٹی گردنوں والے لوگ اپنی اپنی ٹوکریاں بھرتے جاتے ہیں اور کاؤنٹر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سب پیٹا ناٹر ہو چکے۔ اپنی زندگیوں کو بوتلوں اور ذائقوں سے بھر دینے کی کوشش میں، ہم بھول چکے ہیں کہ زندگی کے اصل ذائقے اور لطف کیا تھے۔ مایونیز سے بھرے ہوئے برگر اور salad سوڈا، تلے ہوئے آلو اور گوشت کے ٹکڑے اس سونے پر سہاگہ۔ بنی نوع آدم چلتی پھرتی لاش بن چکا۔ امریکہ اور برطانیہ میں موٹاپا اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہر جگہ آپ کو چربی کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ پاکستان، جہاں فاسٹ فوڈ کا کاروبار تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اب اسی سمت میں بڑھتا نظر آرہا ہے۔

اب کیا کریں؟ اچھے سے آرام دہ جاگرز پہنیں، ہاتھ میں ایک چھتری لیں اور گلیوں میں نکل جائیں۔ بتدریج اس چہل قدمی کو پندرہ منٹ سے بیس منٹ، آدھا گھنٹہ اور تین چار ماہ تک ایک گھنٹے پر لے جائیں۔ شروع میں آہستہ آہستہ چلیں، کچھ ہفتوں بعد رفتار بڑھانا شروع کریں۔ ایک دن آئے گا کہ جب تیز رفتار چہل قدمی سے آپ کا جسم گرم ہو جائے گا تو وہ اور تیزی سے چلنے بلکہ دوڑنے کی خواہش کرے گا۔ سمجھ جائیں کہ زندگی واپس آرہی ہے۔ مجھے اپنا ماموں زاد عزیر امین یاد آتا ہے۔ بچپن ہی سے موٹاپے کا شکار تھا۔ اب جب امریکہ سے لوٹا تو پہچانا نہ جاتا تھا۔ بتایا کہ چھ ماہ 1200 کیلوریز والی خوراک پر گزارے اور ورزش کرتا رہا۔ عالمی ماہرین کہتے ہیں کہ موٹاپے کی کمی میں خوراک کی اہمیت 80 فیصد اور ورزش کا حصہ صرف 20 فیصد ہے۔ آپ کو اپنی خوراک کو لازماً بدلنا پڑے گا۔ صبح اٹھ کر ایک ٹوکری میں وہ خوراک رکھیں، جو ڈاکٹر کے مشورے سے 12، 15 سو کیلوریز پر مشتمل ہو۔ (مردوں کے جسم کو روزانہ کم از کم 2500 کیلوریز اور خواتین کو 2000 کیلوریز درکار ہوتی ہیں)۔ جب آپ کھانے میں اس سے کم توانائی دیتے ہیں تو وہ جسم میں موجود اضافی چربی کے انبار سے یہ توانائی کشید کرنا شروع کرتا ہے اور بتدریج، بہت آہستگی سے یہ وزن کم ہونے لگتا ہے۔ یاد رہے کہ اس مسئلے کا کوئی short term حل موجود نہیں ہے۔ آپ کو کم از کم چھ ماہ کا وقت اپنے ذہن میں رکھنا ہوگا۔



میں نے 1500 کیلوری ڈائٹ پر عمل درآمد کی بہت کوشش کی۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ باقاعدہ کھانا چھوڑتے ہیں تو معدے میں موجود تیزاب آہستہ آہستہ بڑھنے لگتا ہے۔ میں چونکہ acid reflux کا شکار ہوں؛ لہٰذا بڑھی ہوئی تیزابیت مزید مسئلے کا باعث بنتی۔ حل یہ نکالا کہ 24 گھنٹے میں توے کی صرف 2 روٹیاں، اس کے علاوہ دو تین پھل، چینی کی جگہ چائے میں شہد کا ایک چمچ۔ ضرورت پڑنے پر ابلے ہوئے آلو، چنے یا ان کی چاٹ۔ تین ماہ میں چھ کلو وزن کم ہوا۔ پانچ چھ کلو اب بھی باقی ہے۔ وزن اب مزید کم نہیں ہو رہا کہ water weight ختم ہونے کے بعد اب یہ سخت قسم کی چربی ہے۔ اس کے لیے مزید محنت کی ضرورت ہے لیکن 12 میں سے اگر چھ کلو گرام اگر کم ہو جائیں اور وزن میں اضافہ رک جائے، اس کے ساتھ ساتھ روزانہ کی بنیاد پر جسمانی کام اور صحت مند خوراک ایک معمول بن جائے تو اور کیا چاہیے؟ بہت سے لوگ کامیابی کا معیار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کماتے رہیں؛ حالانکہ وہ رقم جو اکاؤنٹ یا جائیداد کی صورت میں آپ کے پاس موجود ہوتی ہے اور جسے آپ استعمال نہیں کر سکتے، وہ آپ کا رزق ہے ہی نہیں۔ حدیث کے مطابق رزق وہ ہے، جو انسان کھا کر ختم کر دے، یا پہن کر بوسیدہ کر دے یا خدا کی راہ میں کسی کو دے دے۔ میرے خیال میں ایک کامیاب زندگی میں روزانہ کی بنیاد پر کچھ جسمانی کام، کچھ روحانی کام (عبادات) اور کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ روزگار کمانے کا فرض تو سب پر عائد ہے ہی اور کوئی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

برطانیہ سے آنے والا ایک دوست یاد آیا۔ کہنے لگا: تم لوگوں کی طرح ہمارے پاس اتنا وقت کہاں کہ کھانا گھر میں بنا کر کھا سکیں۔ ہم تو چلتے پھرتے برگر اور سافٹ ڈرنکس پیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں کام کرنا ہوتا ہے، ہم فارغ لوگ نہیں۔ میں نے ڈھول کی طرح پھولے ہوئے اس کے پیٹ کو دیکھا اور پھر خود سے پوچھا کہ اگر اپنے جسم کے ساتھ وہ یہ سلوک کر رہا ہے تو پھر اس کام کا beneficiary کون ہے؟ اگر آپ اپنے بچوں کے سامنے کاربونیٹڈ سافٹ ڈرنکس، پیزے، برگر، تلے ہوئے چپس وغیرہ کھاتے رہتے ہیں تو آپ ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ وہ اس طرز زندگی کو اختیار کر لیں گے۔ بیس پچیس سال بعد وہ بھی ایک بیمار جسم کے مالک ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔ اگر آپ انہیں کھیلنے کودنے کے لیے نہیں لے جاتے تو بھی آپ ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں جسمانی بھاگ دوڑ سے پیدا ہونے والی مسرت سے لطف اندوز ہونا سکھائیے۔ یہ آپ کا فرض ہے۔ اگر آپ نے نوکروں کی ایک فوج ظفر موج پال کر انہیں بستر پر لیٹے رہنے کی ترغیب دی ہے تو بھی آپ قصوروار ہیں۔ خدا نے یہ زندگی اس طرح سے بنائی ہے کہ ایک خاص حد سے زیادہ ہم اسے آرام دہ نہیں بنا سکتے۔ خالص ترین خوراک کھانے کی کوشش کریں۔ ابلے ہوئے انڈوں میں پکے ہوئے آلو، مچھلی، انگور، آم اور ہر قسم کے پھل، گھر میں بنا ہوا سلاد (بیکری سے ملنے والے سلاد میں مایونیز ہوتا ہے، جو موٹاپے کا باعث بنتا ہے)، یہ وہ چیزیں ہیں جو خالص ترین ہیں۔ بڑھنے کی عمر والے بچوں کے علاوہ دیگر افراد ایک ہی روٹی کھائیں۔ ہاں البتہ اگر آپ روزانہ بہت سا جسمانی کام کرتے ہیں تو پھر اور بات ہے۔ چینی، تلی ہوئی چیزیں، مایونیز، برگر، بیکری آئٹمز اور سب سے بڑھ کر سافٹ ڈرنکس، یہ سب چیزیں بیمار زندگی کی علامت ہیں۔ انہیں اپنا طرز زندگی مت بنائیے۔ اپنے جسم کو مشقت سے گزاریے وہ آپ سے اس کی بھیک مانگ رہا ہے۔

ooo



ٹیکنالوجی کا بیجا استعمال
کرئیر اور روزگار کا خوف

نوجوانوں میں تناؤ کا سبب

مومن فہیم احمد عبدالباری

بھارت دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جس کی بڑی آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ نوجوان ملک کی معاشی و اقتصادی ترقی کا اثاثہ (Asset) ہیں۔ لیکن تعلیمی دباؤ، اچھا کرئیر اور بہترین ملازمت حاصل نہ کر پانے کا خوف یا زندگی میں ناکامی کا ڈر یہ وہ مسائل ہے جو نوجوانوں کے پیش نظر ہیں۔ عالمگیریت کے اس دور میں جہاں ٹیکنالوجی نے انسانوں کو کئی سہولیات بہم پہنچائی ہیں وہیں اس کے نقصانات بھی جگ ظاہر ہیں۔ انگریزی روزنامے ہندوستان ٹائمز نے گذشتہ دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں کے نوجوانوں کا ایک سروے کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ دور جدید میں نوجوان کیوں ذہنی دباؤ، اضطراب اور بے چینی کا شکار ہیں اور ان کے مسائل میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ اگرچہ یہ سروے ایک بہت محدود سیمپل پر مشتمل ہے لیکن اس کے نتائج حیران کن ہیں اور بالخصوص شہری علاقوں کے بیشتر نوجوانوں کے مسائل کی غمازی کرتے ہیں۔ ان عوامل کی بناء پر نوجوان ڈپریشن، تناؤ، بے خوابی، کم عمری میں ذیابیطس اور دل کے عارضے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ یہ نتائج ہمیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ بروقت نوجوانوں کی صحیح رہنمائی اور ذہنی تربیت انتہائی ضروری ہے۔

۸۰ فیصد نوجوان اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بڑھتے دباؤ اور تناؤ کی بناء پر ان کی نیند متاثر ہوئی ہے۔ ۹۳ فیصد طلبہ امتحانات کے ڈر سے بے خوابی کا شکار ہیں جبکہ ۴۵ فیصد ایسے ہیں جو عشق و عاشقی کے چکر میں بے خوابی کا شکار ہیں۔ دہلی میکس ہاسپٹل کے ڈاکٹر سمیر ملہوترا کے مطابق مقابلہ جاتی امتحانات میں ناکامی کا خوف تناؤ اور ڈپریشن کا سب سے اہم سبب ہے۔ تعلیم کے علاوہ خوبصورت نظر آنا بھی طلبہ میں فکرمندی کا باعث ہے۔ بالخصوص کالج میں نیا نیا داخلہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ ایک اہم وجہ فکرمندی ہے کیونکہ اسکول تک ایک جیسے یونیفارم کی بناء پر اس کا احساس نہیں ہوتا لیکن کالج لائف میں کپڑے، ہیئر اسٹائل وغیرہ ان کے اضطراب کی ایک وجہ ہے تقریباً ۴۱ فیصد طلبہ کے لیے یہ ایک اہم مدعا ہے۔ اس کے علاوہ کالج اور ہاسٹل میں ہونے والی ریگنگ کے واقعات بھی نوجوانوں کو شدید ذہنی تناؤ میں مبتلا کرتے ہیں اور بعض معاملات میں تو یہ خودکشی یا جرائم کا سبب بنتے ہیں۔

موجودہ کارپوریٹ اور ٹارگیٹ سیلنگ (Target Selling) کلچر نے نوجوانوں کو اپنے کرئیر میں ناکامی اور روزگار ختم ہوجانے کے ڈر میں مبتلا کر دیا ہے۔ حالانکہ بڑے تعلیمی اداروں میں سو فیصدی پلیسمنٹ کی ضمانت دی جاتی ہے لیکن نوجوان اس فکر میں رہتے ہیں کہ انہیں ان کی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق جاب حاصل ہوگی یا نہیں۔ مزید کاروبار کے مزاج اور کاروباری دباؤ نے نوجوانوں میں ڈپریشن، ذیابیطس اور دل کے عارضے جیسے امراض کا شکار بنا دیا ہے شاید اسی بناء پر موجودہ دور میں طلبہ اور نوجوانوں میں خودکشی، کم عمری میں موت اور جرائم کی طرف راغب ہوجانے کے رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں۔ تقریباً ۳۰ فیصد نوجوان اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انہیں اپنی جاب کھوجانے کا ڈر ہے یہ تو وہ افراد ہیں جو برسر روزگار ہیں جنہیں سرے سے روزگار ہی نہیں ملا ان کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ نوجوان اُن شہروں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں روزگار اور جاب مارکیٹ کے ابھرتے ہوئے مراکز مانا جاتا ہے جیسے کہ پونے، بھوبنیشور اور جے پور وغیرہ۔ تقریباً ایک چوتھائی یا ۲۵ فیصدی نوجوان اپنے رشتوں میں غلط فیصلوں سے فکر مند ہیں۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں جہاں دنیا بھر کی معلومات اپنے اسمارٹ فون پر انگلیاں پھیرنے سے حاصل ہو جاتی ہیں وہیں یہ اسمارٹ فون نوجوانوں کو تنہائی پسند بنانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ تقریباً ۱۰ فیصد نوجوان اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ تنہائی کے خوف کا شکار ہیں۔

اس سروے میں نوجوانوں سے یہ بھی پوچھا گیا کہ وہ اپنی تنہائی یا ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ تقریباً ۷۰ فیصد موسیقی سننے، ۵۳ فیصد فلمیں دیکھنے اور ۴۰ فیصد دوسروں سے بات اور تقریباً اتنے ہی پارٹی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۳۷ فیصد نے اپنی تنہائی اور ذہنی دباؤ سے نجات کے لیے اسمارٹ فون کو استعمال کرنا بتایا ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ نوجوان دراصل اپنے بنیادی مسئلے ہی سے ناواقف ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ملہوترا کا کہنا ہے کہ اسمارٹ فون کا بذات خود استعمال ان امراض کی وجہ ہے۔ ڈرائیونگ کرتے وقت فون پر بات کرنا، ٹیکسٹ میسیج کرنا یا سوشل میڈیا کی پوسٹ دیکھنا وغیرہ غیر متوقع حادثات کا سبب بنتا ہے اس کے علاوہ موبائل ساتھ میں لے کر سونا نیند میں بار بار خلل کا سبب بنتا ہے جس کی بناء پر یہ نوجوان بے خوابی کا شکار ہیں۔

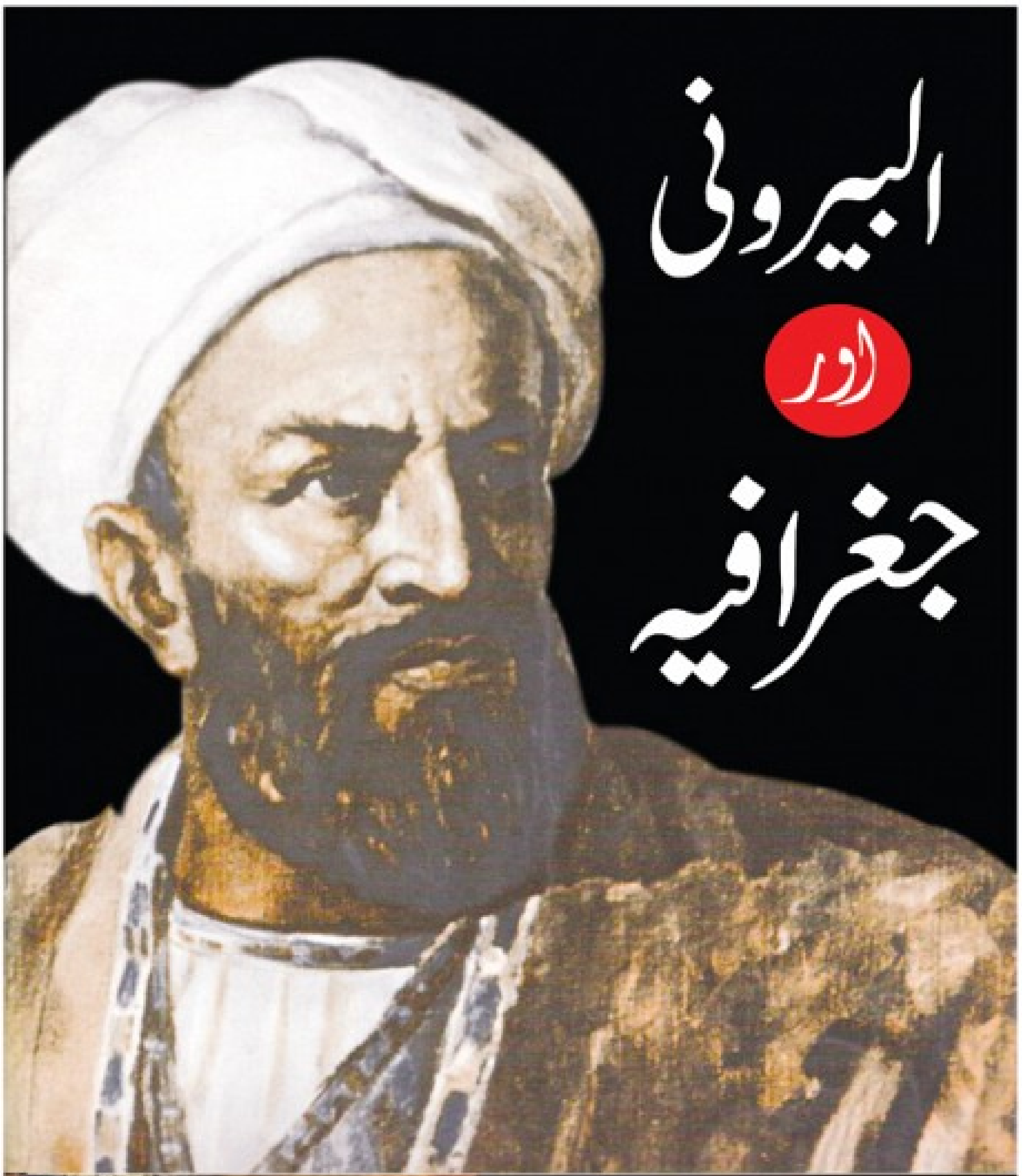
مذکورہ تجزیہ سماج کے تمام طبقوں کے نوجوانوں پر بلا تفریق مذہب صادق آتا ہے۔ شاید اس سروے میں مسلم نوجوانوں سے گفتگو کم کی گئی ہے ورنہ ہمیں یہ قوی امید ہے کہ کم از کم مسلمانوں کے پاس اس طرح کے ذہنی دباؤ اور ڈپریشن سے بچنے کا واضح علاج موجود ہے بشرطیکہ وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس تیز رفتار ترقی اور مادیت پسندی کے دور میں نوجوانوں کی ذہنی سازی اور تربیت کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ooo

لیکچرر صمدیہ جونیئر کالج بھیونڈی

ڈاکٹر ظل الرحمن

البیرونی اور جغرافیہ



البیرونی نے ریاضیات، فلکیات اور تاریخ وجوم کی طرح فن جغرافیہ وہیئت میں بھی کمال کی مہارت حاصل کی۔ آپ نے طول بلاد اور عرض بلاد کو حقائق ومشاہدات کی روشنی میں پیش کیا، ملکوں اور شہروں کی مسافتوں کی تعیین کی، سائنٹفک اصولوں کی بنیاد پر فلکی نقشے تیار کیے اور اپنے گوناگوں منفرد کارناموں کی بدولت ہم عصر جغرافیہ دانوں اور سابق ماہرین فن پر سبقت لے گئے۔

البیرونی نے جغرافیہ وہیئت کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ پروفیسر زکی ولیدی توغان نے البیرونی کے فن جغرافیہ وہیئت کے اہم کاموں کو ایک جگہ جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور نہایت عرق ریزی کے بعد صفۃ المعمورۃ للبیرونی کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافۃ المساکن، الجماہر فی معرفۃ الجواہر اور الصیدنہ سے جغرافیائی معلومات وتحقیقات، طول بلاد وعرض بلاد کے جداول اور شہروں اور ملکوں کی مسافت کی تعیین کے جداول کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ دہلی سے 1927 میں شائع ہوئی۔

البیرونی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم کے پانچویں مقالے کے نویں اور دسویں باب میں خصوصی طور پر کرۂ ارضی کے آباد حصوں کی صورت حال پر بحث کی ہے اور دنیا کے طول بلد اور عرض بلد معلوم کرنے کے لیے جدولیں بیان کیا ہے، یہ سارے جدول تحقیقی وعروضی اور علمی انداز سے تیار کیے گئے ہیں۔

البیرونی کا یہ کمال ہے کہ اس نے جغرافیہ وہیئت اور طول بلاد اور عرض بلاد کی تعیین میں قدماء کی تحقیقات پر از سرنو نظر ڈالی، ان کے نقائص دور کرکے تحقیقی مواد سے دنیا کو روشناس کرایا، اس نے اسفیریک اور پریکٹیکل اسٹرانومی کے عملی تجربات کی بنیاد پر معیاری معلومات پیش کی۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کی جغرافیائی تحقیقات کا گوشہ ابھی تک نامکمل تھا جسے اس نے اپنے مشاہدہ وتجربہ کی بنیاد پر مکمل کیا اور اپنی تحقیقات کے ہر گوشہ کو خالص سائنٹفک بنیادوں پر تولا۔ اس نے جغرافیائی تحقیق میں تقلید وروایت پر عمل کرنے کے بجائے خالصتاً تجربہ ومشاہدہ پر بھروسہ کیا۔ چنانچہ البیرونی اپنی کتاب القانون المسعودی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

میں خود سے پہلے گذرے ہوئے ان مجتہدین ومحققین اصحاب فضل کے راستے پر نہیں چلا ہوں جنہوں نے اپنے اعمال کا مطالعہ اور اپنے تجربات کا استعمال شک وشبہ کی سواری اور تقلید کی روش پر کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بعض اعمال کی تعلیل اور دلیل تلاش کرنے میں بعد والوں کے محتاج ہوئے۔

البیرونی اپنے منفرد جغرافیائی کارناموں کی وجہ سے بطلیموس اور ادریسی پر بھی فائق ہوگئے، ادریسی اور بطلیموس دونوں فن جغرافیہ کے ماہر اور مرجع مانے جاتے ہیں، بطلیموس Ptalemy کی کتاب المجسطی اور ادریسی کی کتاب نزہۃ المشتاق اپنے فن کی شہرۂ آفاق اور مستند کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات موجود نہیں تھیں، البیرونی نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹفک طریقے سے جس قدر رصدی تحقیقات کی جاسکتی تھیں، وہ سب انجام دیں۔ البیرونی نے دوسرے محققین وہیئت دانوں سے استفادہ ضرور کیا لیکن رصدی معلومات کے سلسلے میں جو کچھ بھی بیان کیا وہ مشاہدات وتجربات کی بنیاد پر خالص علمی انداز میں بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ البیرونی کی دنیا ہمیں ادریسی اور بطلیموس کی دنیا سے زیادہ روشن اور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ البیرونی کے اسی کمال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد بیان کرتے ہیں۔

البیرونی نے قدماء کے سرمایہ پر از سرنو نظر ڈالی اور اس کے نقائص دور کیے، اس نے فن جغرافیہ کی بنیاد اسفیریک اور پریکٹیکل اسٹرانومی کے عملی تجارب پر رکھی۔ اس نے دنیا کی تمام معلوم آبادیوں کے طول وعرض کو بحث وتحقیق کے بعد از سرنو مرتب کیا اور قدماء کی غلطیوں کی اصلاح کی، چنانچہ القانون کے علاوہ اس کی چار اور کتابیں اسی موضوع پر ہیں۔ تحدید نہایات الاماکن، تہذیب الاقوال فی تصحیح العروض والاطوال، تصحیف المنقول من العروض والطول، تصحیح الطول والعروض، المساکن المعمورۃ من الارض۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کے ہر گوشہ میں ایک خالص سائنٹفک معیار نظر سے ہر بات کو تولتا ہے اور کسی دوسرے غیر علمی عنصر کا اثر قبول کرنے سے قطعاً منکر ہے۔

البیرونی نے ممالک اور شہروں کے جغرافیہ کو بیان کرنے میں بھی نہایت دقت نظری سے کام لیا، اس نے ہندوستان کے جغرافیہ کو بیان کرتے ہوئے شہروں، نہروں، سیلابوں، پہاڑوں، چوٹیوں، برفوں، بارشوں اور آب وہوا وغیرہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البیرونی نے ہندوستان کے شہروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیتوں، تجارتی اہمیتوں، ان کے ثقافتی حالات اور اسٹریٹیجک محل وقوع کو بیان کیا ہے، ان کے طول بلد اور عرض بلد کے خطوط کو بھی بیان کیا ہے۔ البیرونی کشمیر کی بعض خوبیوں اور وہاں کی سواریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وأهل كشمير رجّالة ليس لديهم دواب ولا فيلة، ويركب كبارهم الفوت وهي (الأسرّة)، ويحملون على أعناق الرجال."

اہل کشمیر ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس چوپایے اور ہاتھی نہیں ہیں، ان کے بڑے بزرگ لوگ توت پر سوار ہوتے ہیں، اسے لوگوں کی گردنوں پر اٹھایا جاتا ہے۔

البیرونی کشمیر کے ایک راستے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"وأشهر مداخلها من قرية "ببنزهان" وهي على منتصف الطريق بين نهري السند وجيلم، ومنها إلى قنطرة على مجتمع ماء "كسناري" وماء "مهوي" الخارجين من جبال "شميلان" الواقعين إلى ماء جيلم ثمانية فراسخ"

اس کا سب سے مشہور داخل ہونے کا دروازہ ببرہان ہے، یہ سندھ اور جہلم ندیوں کے بیچ کے راستے پر ہے، وہاں سے قنطرہ کا راستہ ہے جو کسناری ندی اور مہوی ندی کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے جو دونوں شمیلان پہاڑ سے نکلنے والے ہیں، یہ دونوں جہلم ندی سے آٹھ فرسخ کی دوری پر ہیں۔

کشمیر کے بعض حصوں کی مسافت کے متعلق البیرونی کہتے ہیں۔

"ومدينة كشمير أربعة فراسخ ((12میلا تقريبا مبنية بالطول على حافتي ماء جيلم، وبينهما الجسور والزواريق، ومخرجه من جبال "هرمكوت" التي منها أيضا مخرج "الكنك"، وهي صرود غير مسلوكة لاتذوب ثلوجها ولا تفنى، ووراءها مهاجين أي: الصين العظمى."

کشمیر جہلم ندی کے دونوں کنارہ پر طول میں چار فرسخ 12 میل تقریباً ہے، ان دونوں کے مابین پل اور راستے ہیں، جہلم ندی ہرکوت پہاڑ سے نکلتی ہے، گنگ ندی بھی اسی پہاڑ سے نکلتی ہے، اس کا پانی اصلی وخاص ہے، اس کے پیچھے مہاجین یعنی چین عظمی ہے۔

البیرونی اور نقشہ نگاری (کیرٹوگرافی): اسلام سے قبل عربوں کے یہاں نقشے اور میپ تیار کرنے کا اہتمام نہیں تھا، جب اسلام آیا اور دنیا کے طول وعرض میں پھیلنے لگا تو عربوں نے اس کا اہتمام کیا، پھر انہوں نے بری وبحری نقشے تیار کیے، اس سلسلے میں فلکی وریاضی اصولوں پر اعتماد کیا، اسلامی فتوحات، عالم اسلام کی توسیع اور مختلف ممالک کے مابین تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کی وجہ سے انہیں مخصوص جداول تیار کرنے کی ضرورت پڑی، انہوں نے اوقات کے اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے طول بلاد کے جداول تیار کیے، نقشے میں رنگوں کا بھی استعمال کیا، نیلا رنگ سمندر کے لیے، ہرا رنگ نہروں کے لیے، لال اور میرون رنگ پہاڑوں کے لیے استعمال کیا اور شہروں کو سنہرے حلقوں میں نقش کیا، جن جغرافیہ دانوں نے اس میدان میں بڑا کارنامہ انجام دیا ان میں ادریسی، مقدسی، ابن حوقل، مسعودی اور البیرونی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

نقشے کو تیار کرنے کے فن کو فروغ دینے میں البیرونی کا بہت اہم کردار رہا ہے، انہوں نے اس فن کی منضبط اور مثالی وعملی شکل میں پیش کی، انہوں نے اپنی کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم میں دنیا کا مستدیر (چپٹی شکل) نقشہ بنا کر پیش کیا اور اس میں سمندر کے مقامات کو بیان کیا، اسی طرح اپنی دوسری تصنیف الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ میں آسمان وزمین کے نقشوں کو بیان کیا، مسطح ورق پر دنیا کے نقشے کو اتارنے کے سلسلے میں ان کا بہت بڑا رول ہے۔ ان کی مذکورہ کتاب میں اس سلسلے میں ایک خاص فصل ہے جس میں انہوں نے آسمان کے فلکی نقشوں کے سلسلے میں بھی بات کی ہے۔

البیرونی اور فارمیسی

البیرونی کو عالم اسلامی میں ابو الصیدلۃ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے فارمیسی کے میدان میں نہایت ہی معرکۃ الآراء اور شہرۂ آفاق کتاب لکھی جسے دنیا الصیدنۃ فی الطب کے نام سے جانتی ہے۔ اس کتاب نے البیرونی کو اسلامی طب وفارمیسی کی دنیا میں عظیم مرتبہ ومقام عطا کیا۔ اس کتاب میں مؤلف نے بہت سارے طبی نباتات، جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے فائدے کو ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فارمیسی کے میدان میں بیش بہا مرجع اور نہایت ہی مفید ریفرنس مانی جاتی ہے، اس میں ڈاکٹر اور فارماسسٹ کی ذمہ داریوں اور ان کی اخلاقی پابندیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں تہجی کے حروف کے حساب سے بہت ساری دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے فوائد کو ذکر کیا گیا ہے۔ اہم دواؤں کے نام کو دوسری مختلف زبانوں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس میں دواؤں کی طبیعت اور مقام وجود، محفوظ رکھنے کے طریقے، اثرات، علاجی قوتوں اور خوراک کی مقدار وغیرہ پر بات کی ہے۔ کتاب کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر برکات محمد مراد کہتے ہیں۔

کتاب دو بنیادی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ دیباچہ ہے جس میں مفید تاریخی وضاحتوں کے ساتھ فارمیسی، فارماکولوجیا اور علاج کے سلسلے میں اہم معلومات بیان کی گئی ہیں۔ یہ مقدمہ ایسا مایہ ناز معلومات بھرا ہے جو نہ صرف اسلامی عہد بلکہ فارمیسی کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس میں فارماسسٹ کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں بھی بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے کو طبی مادے کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں کا ذکر ان کے خصائص وافادیات کے ساتھ کیا گیا ہے، اسی طرح انہوں نے مشہور جڑی بوٹیوں کا نام مختلف زبانوں میں لکھا ہے، ان دواؤں کی طبیعت، مقام وجود، محفوظ رکھنے کا طریقہ، اثرات، علاجی قوتیں اور خوراک کی مقدار وغیرہ کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(باقی صفحہ 22 پر)

البیرونی اپنی منفرد جغرافیائی کارناموں کی وجہ سے بطلیموس اور ادریسی پر بھی فائق ہوگئے، ادریسی اور بطلیموس دونوں فن جغرافیہ کے ماہر اور مرجع مانے جاتے ہیں، بطلیموس Ptalemy کی کتاب "المجسطی" اور ادریسی کی کتاب "نزہۃ المشتاق" اپنے فن کی شہرۂ آفاق اور مستند کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں وسط ایشیا، افغانستان، چین اور ہندوستان کے بارے میں تفصیلی معلومات موجود نہیں تھیں، البیرونی نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ ہر اہم مقام کی نسبت سائنٹفک طریقہ سے جس قدر رصدی تحقیقات کی جاسکتی تھیں، وہ سب انجام دیں۔



ادبی وثقافتی سرگرمیاں

مدینہ میں اسرائیلی شہری کی تصویر پر سوشل میڈیا میں غم وغصہ



اسرائیل کے ایک شہری کی سعودی عرب کے شہر مدینہ کی مسجد نبوی میں تصاویر عرب دنیا کے سوشل میڈیا پر غم وغصے کا باعث بن گئی ہیں۔ روس میں پیدا ہونے والے 31 سالہ اسرائیلی شہری بین تسیون نے اپنے ایران، لبنان، سعودی عرب اور اردن کے دورے کی تصاویر سوشل میڈیا پر پوسٹ کی ہیں۔ ان کے فیس بک کے صفحے پر پوسٹ کی جانے والی تصاویر میں انھیں مسلمانوں کے مقدس شہر مدینہ کی مسجد نبوی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تسیون نے فیس بک پر کی جانے والی پوسٹ میں کہا: سعودی عرب کے لوگ یہودی قوم کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔ ایک تصویر میں تسیون کو سعودی عرب کے ٹخنوں تک لمبے روایتی لباس میں تلوار کے ساتھ جسے ثوب کہا جاتا ہے، ڈانس کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک دوسری پوسٹ میں کہا: مشرق وسطیٰ میں امن ایک دوسرے کے لیے محبت اور عزت کے ساتھ۔

واضح رہے کہ غیر مسلمانوں کو مکہ کا دورہ کرنے سے منع کیا جاتا ہے اور انھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کے مرکزی حصے میں داخل نہ ہوں جہاں مسجد نبوی واقع ہے۔ تاہم تسیون کا کہنا ہے کہ مدینہ میں واقع مذہبی مقامات عام افراد کے لیے کھلے ہیں۔ تسیون نے اخبار ٹائمز آف اسرائیل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان ممالک کا دورہ کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ انھوں نے اپنے پیغام کو مختلف ثقافتوں اور عقائد کا احترام قرار دیا۔ واضح رہے کہ بین 2014 میں اسرائیلی شہری بن گئے تھے۔ ان کے بقول عرب دنیا بھی میرے ساتھ دشمنی کے ساتھ پیش نہیں آئی، اور انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسرائیل اور یہودیوں سے محبت کرتے ہیں۔ تسیون نے بتایا کہ انھوں نے مطلوبہ ویزے حاصل کیے اور قانونی طور پر تمام مقدس مقامات میں داخل ہوئے، تاہم انھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے کن پاسپورٹوں پر سفر کیا۔ انھوں نے سوشل میڈیا پر ایران کے شہروں تہران اور قم کے دورے کی بھی تصاویر پوسٹ کیں۔

واضح رہے کہ اسرائیل کے شہریوں کو ایران کا دورہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تسیون کے امن کے اظہار کے باوجود ان کی پوسٹ کی جانے والی تصاویر پر غصے کا اظہار کیا گیا۔ سوشل میڈیا پر عربی ہیش ٹیگ 'مسجد نبوی میں ایک یہودی' کو گذشتہ 24 گھنٹوں میں 90 ہزار سے زیادہ ٹویٹس کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ایک عربی ٹوئٹر صارف کا کہنا تھا: علما جیلوں جبکہ صیہونی مسجد نبوی میں ہیں، یہ پریشان کن ہے۔

ایک دوسرے صارف کا کہنا تھا کہ 'آل سعود کے دور میں صیہونی اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن پیغمبر کی مسجد کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔' ایک اور ٹویٹ میں اس ہیش ٹیگ 'مسجد نبوی میں ایک صیہونی' لکھا تھا: 'مسجد نبوی کے منبر پر ایک صیہونی۔' ٹائمز آف اسرائیل کے مطابق انسٹاگرام پر لوگوں کے ناراضی سے بھرے کمنٹس کی بھرمار دیکھ کر فوٹو شیئرنگ کے اس پلیٹ فارم کو تسیون کا اکاؤنٹ بند کرنا پڑا۔

آنجہانی اندرا گاندھی کا ۱۰۰ واں سال یوم پیدائش منایا گیا

اسرار الحق قاسمی کی موجودگی اور پنٹو چودھری کی صدارت میں پروگرام منعقد



کشن گنج ۱۹ نومبر (محمد عظیم الدین) ضلع کانگریس کمیٹی نے آنجہانی وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کا یوم پیدائش پنٹو چودھری کی صدارت میں اور مشہور عالم دین اور رکن پارلیمنٹ حضرت مولانا اسرار الحق قاسمی کی موجودگی میں سادگی سے منایا گیا۔ اس موقع پر آدی باسی خواتین کو عزت افزا کیا گیا۔ مقامی کانگریس دفتر میں کشن گنج کے ممبر پارلیمنٹ مولانا اسرار الحق قاسمی کی موجودگی میں یوم پیدائش سادگی سے منایا گیا۔ پروگرام کی صدارت کانگریس کے ضلع صدر پنٹو چودھری نے کیا۔ اس موقع پر کانگریس ممبر اسمبلی کشن گنج ڈاکٹر محمد جاوید آزاد کی اہلیہ محترمہ سعیدہ بانو کی جانب سے آدی باسی خواتین کو ایم پی کے دست مبارک سے ساڑی دیکر عزت افزائی کی گئی۔ اس دوران ضلع کانگریس کے متحرک کارکنان کو بھی مولانا اسرار الحق قاسمی شال اوڑھا کر عزت افزا کیا۔ اس تقریب میں پٹنہ سے آئے انچارج کی حیثیت سے ارشاد احمد اور اجئے کمار کے علاوہ نائب ضلع کانگریس صدر محمد سرفراز خان رنگو، ایم ایل اے نمائندہ پرویز رضا، سٹی کانگریس لیڈر لکشمی مودی، صاحب عالم، امام علی چشتی، شمشیر احمد دارا، ارون کمار ساہا، پروفیسر شفیع احمد، نسیم اختر، محمد مستقیم، سنبھو یادو، اویش انجم، کیپٹن انجم، توصیف انظر، بڑکی اور ٹھاکر گنج کے اسمبلی صدر محمد قیصر، نائب صدر (کھرنا) وبیشن جین، انوار الہدیٰ، لکی سنگھ، جئے پرکاش گیری وغیرہ لیڈران اور کارکنان موجود تھے۔

جے ڈی یو ہر محاذ پر ناکام، برسر اقتدار افسران بے لگام: آر جے ڈی

کشن گنج ۱۹ نومبر (محمد عظیم الدین) انتخاب عالم ببلو ضلع صدر آر جے ڈی نے پریس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ برسر اقتدار جدیو چہار جانب ناکام ہیں۔ انکے افسران بے لگام ہیں۔ جدیو کے دونوں ممبران اسمبلی بالترتیب کوچادھامن اور ٹھاکر گنج مجاہد عالم اور محمد نوشاد عالم بہادر دوری کالج کے متعدد طلبا جیل میں ہیں اور انکے لیے کچھ بھی نہیں کر سکیں۔ ویسے طلبا کو بہانی کو لیکر سیاست ضرور کرتے ہیں۔ انتخاب عالم نے کہا کہ سنیچر کو کشن گنج ضلع ہیڈ کوارٹر کے تحت انجمن اسلامیہ کے کمیونٹی ہال میں جدیو کے سٹر لیڈران اور بہار کے متعدد وزراء یہاں آئے اور انکے ہی کارکنان نے وزیر جیند را پرساد یادو کو اپنی خطاب میں انکی توجہ مبذول کرائی مگر ان طلباء کے حق میں کچھ بھی نہیں کیا۔ انتخاب عالم ببلو ضلع صدر راجد نے کہا کہ انکا پروگرام پوری طرح سے ناکام ہو گیا۔ کرایہ کے لوگوں کو اکٹھا کیا تھا۔ خاص طور پر خواتین کو جی آر کی رقم دینے کے نام پر جدیو اپنے پروگرام میں شامل کیا تھا تاکہ لوگ انکی بھیڑ سے متاثر ہوں۔ مگر عوام بھی بھلی بھانتی سمجھتے ہیں کہ کون صحیح اور غلط ہے۔ انہوں نے پتہ کی بات یہ کہی کہ کانگریس کے زمانے میں وزیر اعظم ہند ڈاکٹر منموہن سنگھ قدرتی آفات سیلاب میں ۱۰۰۰ کروڑ روپے کی مدد کی تھی بہار کو مگر نریندر مودی نے محض ۵۰۰ کروڑ روپے اس دفعہ قہر زدہ سیلاب میں گرانٹ کی شکل میں دی تھی جو بہت کم ہے۔ انہوں نے کہا جدیو سیاسی لیڈر اور حکومت بہار کے بجلی وزیر وجیندر پرساد یادو نے اسٹیج پر ہی اپنے اچھے لیڈر کو ڈانٹ پھٹکار کیا جو بے مناسب ہے۔ کل کے اس پروگرام سے انکے کارکنان اور لیڈر خود ہی راہ فراری کا مزاج بنا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا نتیش کمار ہی ہر محاذ پر ناکام ہیں۔ جدیو کا یہ پروگرام بہار کے ہر ضلع میں منعقد کیا گیا ہے۔ اپنی ناکامی کی وجہ سے عوام کے درمیان یہ اس طرح کا اجلاس منعقد کیا جا رہا ہے۔ نتیش کمار کی دور اقتدار میں جرائم میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

حضرت صحابیات کرامؓ کی شان میں گستاخی: دارالعلوم دیوبند کا سخت ردعمل، قانونی کارروائی کا مطالبہ

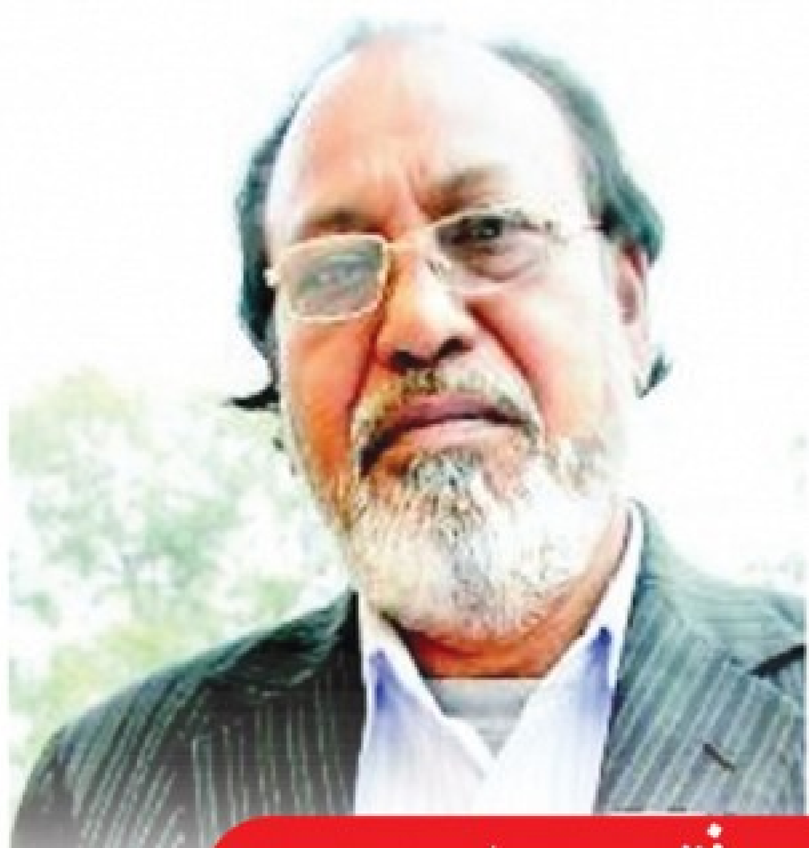
دیوبند: کچھ ٹی وی چینلوں کے مباحثوں کے دوران حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کی شان اقدس میں گستاخانہ کلمات کہے جانے پر دارالعلوم دیوبند نے سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے اور قانونی کارروائی کے ساتھ ساتھ حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اظہار رائے کی حدیں متعین کی جائیں اور کسی بھی مذہبی طبقہ کے اکابر کے خلاف گالی گفتار یا بدکلامی کو قانونی جرم قرار دیا جائے۔ آج یہاں جاری ایک بیان میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مفتی ابوالقاسم نعمانی نے کہا کہ آج ایک اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ چند ٹی وی چینلوں پر دوران مباحثہ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کی شان میں ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے، بلاشبہ یہ عمل تمام مسلمانان عالم کے لئے شدید دل آزاری کا سبب ہے۔ مہتمم دارالعلوم نے کہا کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر برادران وطن کو بھی اس حقیقت کا علم ہونا چاہئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو چاند ستاروں سے تشبیہ دی ہے، اہل بیت اور جملہ صحابہ کرامؓ ہمارے دین کی اساس و بنیاد ہیں، ان میں کسی ایک کی بھی شان میں گستاخی گناہ عظیم ہے اور سب وشتم تو کفر تک لے جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان کسی بھی حالت میں صحابہ کرام اور اہل بیت کی توہین و ہتک برداشت نہیں کر سکتے، معمولی ایمانی حرارت رکھنے والا بھی صحابہ کرامؓ کی شان میں ادنیٰ درجہ کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا، عظمت صحابہ کا لحاظ رکھنا جزو ایمان ہے۔ اسلئے ہم ان تمام چینلوں اور افراد کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں جنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور ہتک عزت کی، ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کا احترام کرتے ہوئے ایسے چینلوں اور افراد کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائیں۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مفتی ابوالقاسم نعمانی نے کہا کہ حکومت کو چاہئے کہ وہ اظہار رائے کی حدیں متعین کرے اور کسی بھی مذہبی طبقے کے اکابر کے خلاف گالی گفتار یا بدکلامی کو قانونی جرم قرار دیا جائے۔

ملک کے مسلمانوں کو کسی کے رحم وکرم کی ضرورت نہی! عقیل الرحمان

سہارنپور (احمد رضا) انگریز حکومت کو ملک سے باہر کرنے کیلئے ہندوستانی عوام خواص نے تین کر شب وروز کی مشقت بھری جدوجہد انجام دیتے ہوئے جو قربانیاں قوم کے افراد نے یہاں پیش کی علاوہ ازیں خاص طور پر ہمارے قابل رشک کردار والے لاکھوں علماء نے اس ملک عظیم کو آزاد کرانے کے لئے جو مسلسل کوششیں اور شہادتیں پیش کی ہیں انکا آج بھی ثانی نہیں انہی قربانیوں کے نتیجہ میں ہمارے اس دیش کو آزادی ملی ہمارے اکابرین نے ملک کی محبت میں اپنی جان ومال کا نذرانہ دے کر اس ملک کو آزاد کرایا اس آج پھر سے ضرورت اس بات کی ہے کہ پیار محبت امن وشانتی کو فروغ دے کر ایک دوسرے کو گلے لگا کر اس ملک کی خوشحالی اور ترقی کیلئے بڑا پروگرام بنایا جائے تبھی ہم سب اس ملک کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور خود بھی اپنے ملک میں کامیاب ہو سکتے اور اس کی خوشحالی اور ملک کی ترقی کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں؟ مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آج یہاں مسلم مسائل پر خاص گفتگو کرتے ہوئے مسلم اسکالر عقیل الرحمان نے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قوم کے مسائل حل کرنے کیلئے ہمارے پاس قرآن موجود ہے!

مسلم اسکالر نے کہا کہ ریاستی سطح پر اقلیتوں کے بنیادی مسائل پر نظر ڈالیں تو ہر معنوں میں پچھلے اکہتر سالوں سے یاسی سطح پر بننے والی ہر ایک جماعت والی سرکار عوام کا اعتماد پانے کے سخت ترین امتحان کیدوران دھیرے دھیرے ناکامی کی دلدل میں پھنستی چلی گئی صرف اور صرف راجہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ جتنے عرصہ تک بھی ملک کے وزیر اعظم رہے اسی دوران اقلیتی فرقہ کو کچھ راحتیں نصیب ہوئی جنکا مسلسل فیض آج بھی منڈل کمیشن کے تحت مسلم فرقہ کی نئی نسل اٹھا رہی ہے مقابلہ جاتی امتحانات میں ابھارہی ہے راجہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی سرکار گر جانیکے بعد کسی بھی سیاسی جماعت کی چنی ہوئی سرکار نے پچھلے اکہتر سالوں میں ایمانداری کے ساتھ کسی بھی سرکاری ادارے یا محکمہ میں مسلم نوجوانوں کو آبادی اور قابلیت کے تناسب سے آج تک بھی دو فیصد نوکریاں نہیں دی ہیں جبکہ یادو، دلت، ہندو بیک ورڈ اور دیگر اعلیٰ ذات کے طبقہ سے متعلق ۷۰ فیصد سے زائد نوجوانوں کو سرکاری نوکریوں میں شامل کیا گیا ہے اگر آپ جانچ پڑتال کرنا چاہیں تو ایماندارانہ جانچ کے بعد سرکاری اعداد وشمار سے یہ باتیں ثابت کیا سکتی ہیں حیرت کی بات تو یہ ہیکہ آج بھی انہی طبقات کے امیدواروں کو مراعات فراہم کی جا رہی ہیں اسی بنیادی نظریات کے مدنظر ریاست کا مظلوم مسلم طبقہ آج ہر ایک پارٹی کیساتھ جڑنے سے کترانے لگا ہے اگر بہوجن سماج پارٹی مسلم طبقہ کے ساتھ ایمانداری سے تعاون کر نیکا وعدہ نبھاتے تو ملک کا مسلم بسپا اور کانگریس کے گٹھ جوڑ کے ساتھ جانیکو راضی ہو سکتا ہے بلدیاتی چناؤ میں صاف ذہن اور ایماندار فتح یاب ہونے والے امیدواروں کی مکمل حمایت کیجائی بیحد ضروری ہے شہری سیٹ پر حاجی فضل الرحمان کی شخصیت بھی انکی خوبیوں پر منحصر ہے ایسے امیدواروں کو ووٹ دیکر مسلم ووٹ کا وزن بھی کو معلوم ہو جائیگا!

مسلم اسکالر عقیل الرحمان نے بیباک انداز میں واضح کیا کہ آج منتخب آپکے سامنے ہیں پچھلے ہی ضلع پنچایتوں اور دیگر نچلے چناؤں میں اسسال سماجوادی پارٹی کچھ سیٹیں حاصل کر چکی ہو مگر اسمبلی کے چناؤ میں سپا مظفر نگر اور سہارنپور کے دل دیوبند اسمبلی الیکشن کو جیت پانے میں بری طرح سے ناکام رہی ہے آج بھی حالات ایسے ہی ہیں اگر تو سماجوادی پارٹی کے امیدوار صرف مسلم ووٹ کاٹ کر بھاجپا کو فائدہ پہنچانیکا کام انجام دے رہی ہے آج اسی وجہ سے عوام کا سپا سے اعتماد قطعی طور پر اٹھ چکا ہے عام چرچہ بھی ہے کہ آنے والے لوک سبھا ۲۰۱۹ کا اہم چناؤ بھی سماجوادی پارٹی بھاجپا کو فائدہ پہنچانے کے مقصد سے ہی لڑیگی کیونکہ سپا نے گزشتہ عرصہ کے دوران مسلم طبقہ سے کئے گئے اپنے پختہ وعدے توڑتے ہوئے سیکولر ووٹ کو ہمیشہ بڑے پیمانہ پر ضرب پہنچائی ہے عام چرچہ ہے کہ کبھی ملائم سنگھ نے ہی سونیا کو وزیر اعظم بنائے جانے کا زبردست اپوز کیا تھا جبکہ سماجوادی قائد نے بھاجپا کے ساتھ ہمیشہ ہی اندرونی طور سے تعلقات اچھے بنائے رکھے آج بھی ملائم کی چھوٹی بہو کے بھاجپا پائی کمان سے بہت نزدیکی رشتے قائم ہیں اسی لئے سماجوادی پر اب مہذب افراد خاص طور سے مسلمانوں اور پچھڑوں کا یقین نہیں رہ گیا ہے سیاسی جماعتوں کے سترنگی چال میں الجھ کر آج مسلمان بلاوجہ ذلیل وخوار ہو رہا ہے جبکہ قوم کی فلاح اور خوشحالی کیلئے ہی اسلام نے اپنے وجود سے ہمہم پر تعلیم کے حصول کیلئے کافی زور دالا ہے اسلام کہتا ہیکہ ہر صورت سے پہلے تعلیم حاصل کریں لیکن امت مسلمہ آج تعلیمی میدان میں کافی پیچھے ہے خصوصا ہندوستان میں مسلمانوں کی ۳۰ کروڑ بھاری بھر کم آبادی بڑی آبادی موجود ہے



افق اردو ادب کا چاند سورج

چندر بھان خیال

ڈاکٹر شہلا نواب

اردو

ادب کے افق کا چاند اور سورج ایک ساتھ یقیناً اس ہیڈنگ کو پڑھ کر قارئین چونک جائیں گے مگر یہی سچ ہے کہ چندر بھان خیال چاند اور سورج ایک ساتھ ہیں۔ ہندی میں چندر کا مطلب ہے چاند اور بھان کا مطلب ہے سورج۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سورج کی آب و تاب ہی نہیں چاندنی کی ٹھنڈک بھی ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ زندگی کے تجربوں اور حوادث کو ایک انقلابی لب و لہجہ کے ساتھ بیان کرتا ہے وہیں چاند کی مدھم روشنی اور اس ٹھنڈک خوبصورتی کا احساس دلاتی ہے یہی ہے چندر بھان خیال کی شاعری نرم بھی اور گرم بھی۔

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کیلیں ان کے نام کی صفات موجود ہوں میں ان کے نام کے اعتبار سے اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے نام کی صفات ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ بات کرو تو لگتا ہے اردو زبان کی چاشنی الفاظ کی شکل میں رواں ہے اور سننے سے ہی ایک معطری ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اے ماتوی کے الفاظ میں "چندر بھان خیال کی ابتدائی دور کی نظمیہ شاعری میں احتجاجی باغیانہ اور انقلابی پہلو جا بجا نظر آتے ہیں لیکن ان کے الفاظ میں گھن گرج اور جوش نظر نہیں آتا ہے بلکہ وہ اپنی نظمیہ شاعری میں دھیمے نرم و نازک اور سادہ و سلیس زبان کا استعمال بڑے ہی فنی لطائف کے ساتھ کرتے ہیں جس سے ان کی غیر معمولی نظمیہ شاعری میں فنی حسن و جمال پیدا ہو گیا ہے۔ وہ نعرے نہیں لگاتے اور شور نہیں کرتے ہیں وہ ہنگامہ نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی جلوس میں شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے فکری و فنی شعور و آگہی منفرد لب و لہجہ و ہیولائی اثرات اور مختلف رنگ و آہنگ سے قاری کو نظمیہ شاعری سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان کو غور و فکر کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں"۔ بلاشبہ یہی الفاظ ان کی شاعری اور ذات کے ترجمان ہیں۔



نام چندر بھان خیال تخلص، 30 اپریل 1946 کو ہوشنگ آباد (ایم پی) کے ضلع بابائی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام کنجی لال بھگور یہ اور والدہ اجودھی بائی۔ مجھے ان کے خاندان کے افراد کے ناموں میں ایک بہت ہی دلچسپ بات یہ لگی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام ہے نشکرش (نتیجہ) اس کے علاوہ سنگھرش، استراکش اور اکارش ہیں۔ ان ناموں میں بھی ایک انفرادیت دکھائی دیتی ہے۔ ساگر یونیورسٹی (ایم پی) سے بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اردو، ہندی، انگلش اور سنسکرت پر عبور حاصل ہے۔

انہوں نے صحافت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اسی میدان میں نئے نئے باب لکھے۔ کئی سالوں تک اردو روزنامہ "سویرا" اور "سچ" میں بطور سب ایڈیٹر کام کیا۔ اس کے بعد 1983 سے 2006 تک روزنامہ "قومی آواز" میں بطور سینئر کورسپونڈنٹ کام کیا۔ آجکل ہفت روزہ ہندی "بھاویہ بھارت ٹائمس" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اب تک ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں شعلوں کا سفر (شعری مجموعہ) 1979 گمشدہ آدمی کا انتظار (نظمیں) 1996 کمار پاشی ایک انتخاب 1997 (دہلی اردو اکادمی سے شائع) لولاک (حضرت محمد ﷺ کی زندگی سے متاثر ہو کر 2000) سلگتی سوچ کا سایہ (ہندی شعری مجموعہ) 2002 صبح مشرق کی اذان (2008) کلیات کمار پاشی 2012 نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج سے شائع۔ اس کے علاوہ چندر بھان خیال کو بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ جن میں خاص طور سے اقبال سمان 10-2009 مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ٹیگور لٹریچر ایوارڈ 2010 ساہتیہ اکادمی اور سیمسنگ انڈیا، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ ہیں۔

چندر بھان خیال نے مختلف عہدوں اور منصبوں پر رہ کر اردو زبان کی خدمت کی ہے اور اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان صرف کسی ایک مذہب و ملت سے وابستہ نہیں پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ این بی ٹی، ساہتیہ اکادمی یا پھر دہلی اردو اکادمی ایسے نہ جانے کتنے اداروں کے ممبر، سیکریٹری اور کنوینر رہے ہیں۔ آجکل اردو ایڈوائزری بورڈ ساہتیہ اکادمی کے کنوینر ہیں اور 2013 سے بطور کنوینر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے مختلف تاثرات قارئین کے لئے حاضر ہیں جو ان کو رائے قائم کرنے میں مددگار ہیں۔

بقول شمیم حنفی "انہوں نے ذات و کائنات سے پرے حقیقت کے تیسرے بعد کی تلاش و جستجو بھی کی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں اظہار کے ایک نئے طور کی پہچان آسانی سے کی جا سکتی ہے"۔ ڈاکٹر انور سدید ان کے بارے میں لکھتے ہیں "چندر بھان خیال کی اپنی ایک الگ پہچان بھی ہے اور انکو نظموں میں انہوں نے نہ صرف جدید کے بہاؤ کو قائم رکھا ہے بلکہ انہیں ایک الگ اسلوب میں پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے" "کمار پاشی کے مطابق "خیال کی نظمیں پڑھتے ہوئے سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ فرد اپنی ذات کے اندھیروں میں گم نہیں ہے بلکہ وہ جلتے سلگتے معاشرے کے درمیان کسی ابر باراں کا منتظر ہے۔ اپنے اردو پیش پھیلی ہوئی بے منظری پر اوس نیوٹرون کے داخلے سے ہراساں اور انسانی قدروں اور عقیدوں کی پامالی پر ایک بے بس احتجاج کے ساتھ اس عزم کا متلاشی ہے جس کے سہارے وہ اپنی معاشرے کی زندگی کو جی سکے"۔

زبیر رضوی ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں "چندر بھان خیال کے ہاں ایک اور حاوی شعری سچائی اپنے ارد گرد کے ساتھ ایک بامعنی ربط قائم کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے آپ فرد اور معاشرے کے وسیع تر مفہوم میں بھی لے سکتے ہیں۔ یہاں خیال کی تخلیقی ذہانت فرد اور سماج کے درمیان رشتوں کی بازیابی میں اس جانے پہچانے عمرانی رویے سے سمجھوتہ نہیں کرتی جو فرد کے ہاتھوں سے تیر و کمان چھین لیتا ہے"۔

چندر بھان خیال کی شاعری کے بارے میں جناب گوپی چند نارنگ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے "اردو پر فی زمانہ جو غیبی وقت پڑا ہے اور اقدار شکنی اور نفسا نفسی کا جو دور دورہ ہے ایسے میں اگر کچھ دیے ایسے بھی جلتے رہیں تو راہ کا اندھیرا اگر کم نہ ہو گا تو کم از کم بڑھے گا تو نہیں"۔

چندر بھان خیال کی شاعری کا کچھ خاص حصہ حاضر ہے

کوئی گلزار کہے عشق کی میراث کہے
میں تو افکار کا اعجاز کہوں گا اس کو
شاہ کے سایے کی پھیلی ہوئی تاریکی میں
بے زبان لوگوں کی آواز کہوں گا اس کو

☆☆☆

صرف ممتاز کا مدفن اسے کیسے کہہ دیں
یہ تو جینے کی بھی توفیق دیا کرتا ہے

☆☆☆

ہر گھڑی ہے جبر و ظلمت تعاقب میں مرے
اے خیال اب آرزوئے دل کروں تو کیا کروں

☆☆☆

وسیع دشت تمنا کے چراغ سینے پر
سلگتے درد کا آنچل نہ سرد ہوگا کبھی

☆☆☆

آگ ہاتھوں میں لیے کرب کے عریاں پیکر
رقص کرتے ہیں مسلسل مری تنہائی میں

چندر بھان خیال کی شاعری زندگی کی دھوپ میں سائبان کی طرح ہے اور رات کی چاندنی میں ہونے والی ہلکی ہلکی بوندا باندی میں زندگی کی تراوٹ ہے جو حالات کی کڑواہٹ کو ختم کر دیتی ہے۔

○○○

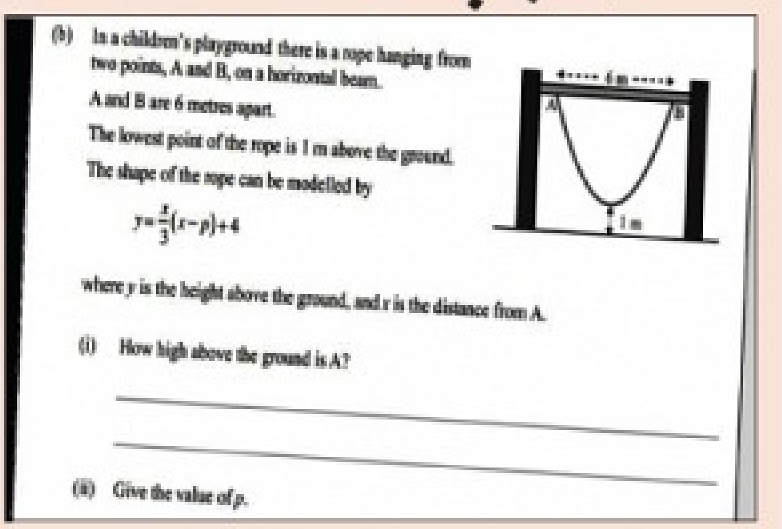
ڈینگی کا علاج، اسپتال کا بل 25 ہزار ڈالر

دہلی کے قریب ایک ہسپتال میں ڈینگی کے ہاتھوں ایک سات سالہ بچی کی موت کے بعد اس کے والدین کو 25 ہزار ڈالر (16 لاکھ روپے سے زیادہ) کا بل دیے جانے پر سوشل میڈیا پر ہسپتال کو شدید تنقید کا سامنا ہے۔ سوشل میڈیا پر اس مہم کے بعد وزیر صحت نے اس معاملے کی تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ بچی کے والدین کا کہنا ہے کہ ہسپتال نے انھیں دو ہفتے کا جو بل دیا ہے اس میں چھ سو سے زیادہ سرنجوں اور 16 سو دستانوں کی قیمت بھی شامل ہے۔ عام لوگوں کی نظر میں یہ معاملہ گزشتہ ہفتے اس وقت پیش آیا جب بچے کے والدین کے ایک دوست نے ہسپتال کے بل کی تفصیلات ٹوئٹر پر شیئر کر دیں۔ اس کے جواب میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے ٹویٹ کیا اور شدید برہمی کا اظہار کیا۔ تاہم دہلی کے قریبی علاقے گڑگاؤں میں واقع ہسپتال کا کہنا تھا کہ انھوں نے بل میں جو اخراجات شامل کیے وہ درست ہیں۔ ٹوئٹر پر ہسپتال کا جو بل شائع کیا گیا ہے وہ 20 صفحات پر مشتمل ہے اور ہسپتال پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے خون میں شوگر کی مقدار جانچنے کے لیے استعمال کی جانے والی کم قیمت سٹرپ یا کاغذ کی کترن کی قیمت کئی گنا زیادہ لگائی ہے۔

تمام ضروری اقدامات اٹھائیں گے: وزیر صحت

لوگوں کی جانب سے فورٹس میموریل ہسپتال پر مسلسل تنقید کے بعد وزیر صحت جے پی نڈا نے ٹوئٹر پر لکھا کہ ہم اس حوالے سے تمام ضروری اقدامات اٹھائیں گے۔ اس دوران ہسپتال نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بچی کا وہی علاج کرنے کی کوشش کی جو کہ ڈینگی میں کیا جاتا ہے۔ بیان کے مطابق انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں بچی کو جو ادویات وغیرہ دی گئیں اس میں اسی معیار کو برقرار رکھا گیا جو کسی انفیکشن کے علاج کے لیے دنیا بھر میں رائج ہے۔ ڈینگی کا شکار ہونے والی بچی کا نام آدیا سنگھ بتایا جاتا ہے اور وہ ستمبر میں انتقال کر گئی تھی۔ اس پر ڈینگی کا حملہ اگست میں ہوا تھا اور جب مہینے کے آخر میں اسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا اس وقت تک اس کا مرض بڑھ چکا تھا لڑکی کے والد جینت سنگھ نے مقامی ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ ان کی بیٹی کو ہسپتال میں داخل کرانے کے ایک دن بعد ہی وینٹی لیٹر پر ڈال دیا گیا تھا۔ 'ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ بچی کے دماغ پر اثر ہو گیا ہو لیکن ہسپتال والوں نے اس کا کوئی ایم آر آئی اسکین نہیں کیا۔ ہسپتال کا کہنا ہے کہ جب بچی کو ہسپتال میں داخل کیا گیا تو ڈینگی کا مرض بہت بڑھ چکا تھا اور وہ ڈینگی شاک سینڈروم کے درجے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہسپتال کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے بچی کے والدین کو اس کی نازک صورت حال کے بارے میں باخبر رکھا تھا۔

حساب کا پرچہ جس نے سب کو رُلا دیا



(b) In a children's playground there is a rope hanging from two points, A and B, on a horizontal beam.

A and B are 6 metres apart.

The lowest point of the rope is 1 m above the ground.

The shape of the rope can be modelled by

$$y = \frac{x}{3}(x-p)+4$$

where y is the height above the ground, and x is the distance from A.

(i) How high above the ground is A?

(ii) Give the value of p.

نیوزی لینڈ میں بچوں کے سیکنڈری اسکول کے ریاضی کے پرچے میں بچوں کو ایک ایسا سوال حل کرنے کو کہا گیا جس نے انھیں رلا دیا اور بات اتنی پھیل گئی ہے کہ اب ملک کے وزیر تعلیم نے اس معاملے کی تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ روزنامہ نیوزی لینڈ ہیرالڈ کے مطابق نیوزی لینڈ میں سیکنڈری اسکول کی سند کے لیے جاری امتحانات میں ریاضی کا ایک امتحان ہوا لیکن اکثر امتحانی مراکز سے نکلنے والے بچوں نے شکایت کی کہ پرچے کے کچھ حصے ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ بچوں کا کہنا تھا کہ اب تک ریاضی کے تین پرچے ہو چکے ہیں اور تینوں میں ایسے سوال تھے جن کو حل کرنا ناممکن تھا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ ایک طالبعلم کو شکایت ہے کہ نہ صرف پرچے کے کچھ حصے 'سمجھ سے باہر' تھے بلکہ کچھ ایسے تھے جن میں معلومات اتنی کم تھیں کہ آپ ان سوالوں کو حل ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ سوال ایسے بھی تھے جو نصاب سے باہر تھے۔ ایک سوال جس پر سب سے زیادہ لے دے ہو رہی ہے اس کا تعلق ریاضی کی دو درجی مساوات یا کوارڈریٹک ایکویشن سے تھا۔ جو کہ آپ کو سیکنڈری کے درجہ دوم تک پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ اب تک ملک بھر سے ریاضی کے 22 اساتذہ نے وزارت تعلیم اور امتحان لینے والے ادارے کو ایک خط لکھ کر شکایت کی ہے کہ بچوں کو ناممکن سوال حل کرنے کو دیے گئے۔ ان میں سے ایک استاد کا کہنا تھا کہ 'قومی سطح کے ایک امتحان میں آپ توقع کرتے ہیں کہ سوالوں کا معیار بہتر ہوگا۔' نیوزی لینڈ میں یہ پہلا موقع نہیں کہ وزیر تعلیم کرس ہوپکن کو اس معاملے میں مداخلت کر کے تفتیش کا حکم دینا پڑا ہے۔ پچھلے سال بھی لوگوں نے شکایت کی تھی کہ ریاضی درجہ اول کا پرچہ بہت مشکل تھا جبکہ درجہ سوئم کے پرچے میں ایک ایسی غلطی تھی جس کی وجہ سے سوال حل کرنا ناممکن تھا۔ تاہم امتحان لینے والے ادارے 'نیوزی لینڈ کوالیفیکیشن اتھارٹی' کا کہنا ہے کہ وہ امتحانات کے معیار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ادارے کی سربراہ کرسٹین کے کلیلی کا کہنا تھا کہ 'امتحانات میں کچھ سوال ایسے ہوں گے جو طالبعلموں کو زیادہ مشکل لگیں گے۔ خاص طور پر وہ سوال جو اعلیٰ تعلیمی معیار کے حامل بچوں کے لیے ہوں گے۔' لیکن والدین ادارے کی اس توجیح سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ اس سے خوش نہیں ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ 'میں آکلینڈ کے علاقے کے بہت سے سکولوں کے بچوں کو جانتا ہوں۔ اور ملک کے دیگر علاقوں میں بھی ریاضی کے امتحان کے بعد بچوں کے اعتماد کو دھچکا پہنچا ہے اور وہ ٹوٹ گئے ہیں۔' کیا آپ بھی اس قسم کا سوال حل کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ریاضی کے پرچے کا ایک اور سوال حاضر ہے۔



افق اردو ادب کا چاند سورج

چندر بھان خیال

ڈاکٹر شہلا نواب



اردو

ادب کے افق کا چاند اور سورج ایک ساتھ یقیناً اس ہیڈنگ کو پڑھکر قارئین چونک جائیں گے مگر یہی سچ ہے کہ چندر بھان خیال چاند اور سورج ایک ساتھ ہیں۔ ہندی میں چندر کا مطلب ہے چاند اور بھان کا مطلب ہے سورج۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی شاعری میں سورج کی آب و تاب ہی نہیں چاندنی کی ٹھنڈک بھی ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ زندگی کے تجربوں اور حوادث کو ایک انقلابی لب و لہجہ کے ساتھ بیان کرتا ہے وہیں چاندکی مدھم روشنی اور اس ٹھنڈک خوبصورتی کا احساس دلاتی ہے یہی ہے چندر بھان خیال کی شاعری نرم بھی اور گرم بھی۔

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کیس ان کے نام کی صفات موجود ہوں میں ان کے نام کے اعتبار سے اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے نام کی صفات ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ بات کرتو لگتا ہے اردو زبان کی چاشنی الفاظ کی شکل میں رواں ہے اور سننے سے ہی ایک معطری ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اے ماولی کے الفاظ میں "چندر بھان خیال کی ابتدائی دور کی نظمیہ شاعری میں احتجاجی باغیانہ اور انقلابی پہلو جا بجا نظر آتے ہیں لیکن ان کے الفاظ میں گھن گرج اور جوش نظر نہیں آتا ہے بلکہ وہ اپنی نظمیہ شاعری میں دھیمے نرم و نازک اور سادہ و سلیس زبان کا استعمال بڑے ہی فنی لطائف کے ساتھ کرتے ہیں جس سے ان کی غیر معمولی نظمیہ شاعری میں فنی حسن و جمال پیدا ہو گیا ہے۔ وہ نعرے نہیں لگاتے اور شور نہیں کرتے ہیں وہ ہنگامہ نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی جلوس میں شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے فکری وفنی شعور و آگہی، منفرد لب و لہجہ و بوباس، ملائی اثرات اور مختلف رنگ و آہنگ سے قاری کو نظمیہ شاعری سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان کو غور و فکر کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں"۔ بلاشبہ یہی الفاظ ان کی شاعری اور ذات کے ترجمان ہیں۔

نام چندر بھان خیال تخلص، 30 اپریل 1946 کو ہوشنگ آباد (ایم پی) کے ضلع بابائی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام کنجی لال بھگوریہ اور والدہ اجودھی بائی۔ مجھے ان کے خاندان کے افراد کے ناموں میں ایک بہت ہی دلچسپ بات یہ لگی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام ہے نشکرش (نتیجہ) اس کے علاوہ سنگھرش، اترا کرش اور اکارش ہیں۔ ان ناموں میں بھی ایک انفرادیت دکھائی دیتی ہے۔ ساگر یونیورسٹی (ایم پی) سے بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اردو، ہندی، انگلش اور سنسکرت پر عبور حاصل ہے۔

انہوں نے صحافت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اسی میدان میں نئے نئے باب لکھے۔ کئی سالوں تک اردو روزنامہ "سویرا" "اور "سچ" میں بطور سب ایڈیٹر کام کیا۔ اس کے بعد 1983 سے 2006 تک روزنامہ "قومی آواز" میں بطور سینئر کورسپونڈنٹ کام کیا۔ آجکل ہفت روزہ ہندی "مہاجن بھارت ٹائمس" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اب تک ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ شعلوں کا سفر (شعری مجموعہ) 1979، گمشدہ آدمی کا انتظار (نظمیں) 1996، کمار پاشی ایک انتخاب 1997 (دہلی اردو اکادمی سے شائع) لولاک (حضرت محمد ﷺ کی زندگی سے متاثر ہوکر 2000) سلگتی سوچ کا سایہ (ہندی شعری مجموعہ) 2002، صبح مشرق کی اذان (2008) کلیات کمار پاشی 2012 نیشنل کونسل فار دی پروموشن آف اردو لینگویج سے شائع۔ اس کے علاوہ چندر بھان خیال کو بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ جن میں خاص طور سے اقبال سمان 10-2009 مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ٹیگور لٹریچر ایوارڈ 2010 ساہتیہ اکادمی اور سیمسنگ انڈیا، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ ہیں۔

چندر بھان خیال نے مختلف عہدوں اور منصبوں پر رہ کر اردو زبان کی خدمت کی ہے اور اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان صرف کسی ایک مذہب و ملت سے وابستہ نہیں پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ این بی ٹی، ساہتیہ اکادمی یا پھر دہلی اردو اکادمی ایسے نہ جانے کتنے اداروں کے ممبر، سکریٹری اور کنوینر رہے ہیں۔ آجکل اردو ایڈوائزری بورڈ ساہتیہ اکادمی کے کنوینر ہیں اور 2013 سے بطور کنوینر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے مختلف تاثرات قارئین کے لئے حاضر ہیں جو ان کو رائے قائم کرنے میں مددگار ہیں۔

بقول شمیم حنفی "انہوں نے ذات و کائنات سے پرے حقیقت کے تیسرے بعد کی تلاش و جستجو بھی کی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں اظہار کے ایک نئے طور کی پہچان آسانی سے کی جاسکتی ہے"۔ ڈاکٹر انور سدید ان کے بارے میں لکھتے ہیں "چندر بھان خیال کی اپنی ایک الگ پہچان بھی ہے اور انکو نظموں میں اس نے نہ صرف جدید کے بہاؤ کو قائم رکھا ہے بلکہ انہیں ایک الگ اسلوب میں پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے"۔ کمار پاشی کے مطابق "خیال کی نظمیں پڑھتے ہوئے سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ فرد اپنی ذات کے اندھیروں میں گم نہیں ہے بلکہ وہ جلتے سلگتے معاشرے کے درمیاں کسی ابر باراں کا منتظر ہے۔ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی بے منظری پر اداس، نیوٹرون کے داخلے سے ہراساں اور انسانی قدروں اور عقیدوں کی پامالی پر ایک دبے دبے احتجاج کے ساتھ اس عزم کا متلاشی ہے جس کے سہارے وہ اپنی معاشرے کی زندگی کو جی سکے"۔

زبیر رضوی ان کے بارے میں یوں قمطراز ہیں "چندر بھان خیال کے ہاں ایک اور حاوی شعری سچائی اپنے ارد گرد کے سات ایک بامعنی ربط قائم کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ فرد اور معاشرے کے وسیع تر مفہوم میں بھی لے سکتے ہیں۔ یہاں خیال کی تخلیقی ذہانت فرد اور سماج کے درمیان رشتوں کی بازیابی میں اس جانے پہچانے عمرانی رویے سے سمجھوتہ نہیں کرتی جو فرد کے ہاتھوں سے تیر و کمان چھین لیتا ہے"۔

چندر بھان خیال کی شاعری کے بارے میں جناب گوپی چند نارنگ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے "اردو پر فی زمانہ جو بے خبری وقت پڑا ہے اور اقدار شکنی اور نفسا نفسی کا جو دور دورہ ہے ایسے میں اگر کچھ دیئے ایسے بھی جلتے رہیں تو رات کا اندھیرا اگر کم نہ ہوگا تو کم از کم بڑھنے کا تو نہیں"۔

چندر بھان خیال کی شاعری کا کچھ خاص حصہ حاضر ہے

کوئی گلزار کہے عشق کی میراث کہے
میں تو افکار کا اعجاز کہوں گا اس کو
شاہ کے سایے کی پھیلی ہوئی تاریکی میں
بے زباں لوگوں کی آواز کہوں گا اس کو

☆☆☆

صرف ممتاز کا مدفن اسے کیسے کہہ دیں
یہ تو جینے کی بھی توفیق دیا کرتا ہے

☆☆☆

ہر گھڑی ہے جبر و ظلمت تعاقب میں مرے
اے خیال اے آرزوئے دل کرن کوئی کرن

☆☆☆

وسیع دشت تمنا کے چراغ جینے پر
سلگتے درد کا آنچل نہ سرد ہوگا کبھی

☆☆☆

آگ ہاتھوں میں لیے کرب کے عریاں پیکر
رقص کرتے ہیں مسلسل مری تنہائی میں

چندر بھان خیال کی شاعری زندگی کی دھوپ میں سائبان کی طرح ہے اور رات کی چاندنی میں ہونے والی ہلکی ہلکی بھنڈا باندی میں زندگی کی تراوٹ ہے جو حالات کی کڑواہٹ کو ختم کر دیتی ہے۔

○○○

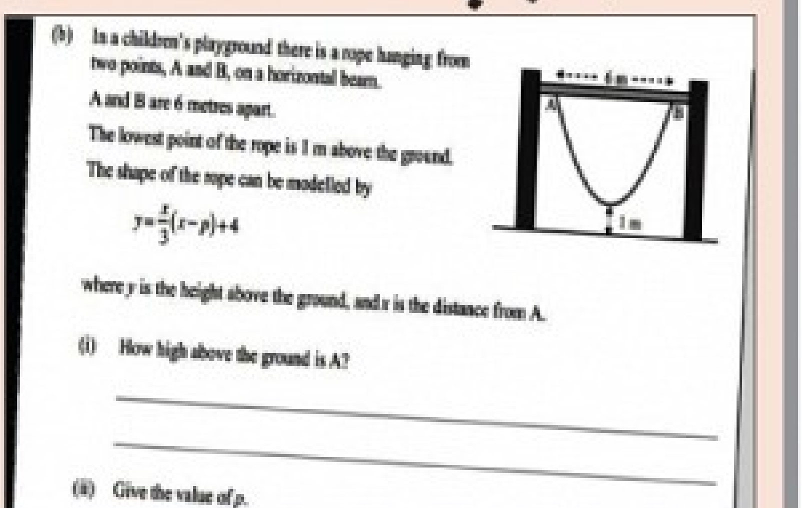
ڈینگی کا علاج، اسپتال کا بل 25 ہزار ڈالر

دہلی کے قریب ایک ہسپتال میں ڈینگی کے ہاتھوں ایک سات سالہ بچی کی موت کے بعد اس کے والدین کو 25 ہزار ڈالر (16 لاکھ روپے سے زیادہ) کا بل دیے جانے پر ہسپتال کو شدید تنقید کا سامنا ہے۔ سوشل میڈیا پر اس مہم کے بعد وزیر صحت نے اس معاملے کی تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ بچی کے والدین کا کہنا ہے کہ ہسپتال نے انھیں دو ہفتے کا جو بل دیا ہے اس میں چھ سو سے زیادہ سرنجیں اور 16 سو دستانوں کی قیمت بھی شامل ہے۔ عام لوگوں کی نظر میں یہ معاملہ گزشتہ ہفتے اس وقت پیش آیا جب بچے کے والدین کے ایک دوست نے ہسپتال کے بل کی تفصیلات ٹوئٹر پر شیئر کر دیں۔ اس کے جواب میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے ٹویٹ کیا اور شدید برہمی کا اظہار کیا۔ تاہم دہلی کے قریبی علاقے گڑگاؤں میں واقع ہسپتال کا کہنا ہے کہ انھوں نے بل میں جو اخراجات شامل کیے ہیں وہ درست ہیں۔ ٹوئٹر پر ہسپتال کا جو بل شائع کیا گیا ہے وہ 20 صفحات پر مشتمل ہے اور ہسپتال پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے خون میں شوگر کی مقدار جانچنے کے لیے استعمال کی جانے والی کم قیمت سٹرپ یا کاغذ کی کترن کی قیمت کئی گنا زیادہ لگائی ہے۔

تمام ضروری اقدامات اٹھائیں گے: وزیر صحت

لوگوں کی جانب سے فورٹس میموریل ہسپتال پر مسلسل تنقید کے بعد وزیر صحت جے پی نڈا نے ٹوئٹر پر لکھا کہ ہم اس حوالے سے تمام ضروری اقدامات اٹھائیں گے۔ اس دوران ہسپتال نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بچی کا وقتی علاج کرنے کی کوشش کی جو کہ ڈینگی میں کیا جاتا ہے۔ بیان کے مطابق انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں بچی کو جو ادویات وغیرہ دی گئیں اس میں اسی معیار کو برقرار رکھا گیا جو کسی انفیکشن کے علاج کے لیے دنیا بھر میں رائج ہے۔ ڈینگی کا شکار ہونے والی بچی کا نام ادیا سنگھ بتایا جاتا ہے اور وہ ستمبر میں انتقال کرگئی تھی۔ اس پر ڈینگی کا حملہ اگست میں ہوا تھا اور پھر جب مہینے کے آخر میں اسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا اس وقت تک اس کا مرض بڑھ چکا تھا لڑکی کے والد جینت سنگھ نے مقامی ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ ان کی بیٹی کو ہسپتال میں داخل کرانے کے ایک دن بعد ہی وینٹی لیٹر پر ڈال دیا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ بچی کے دماغ پر اثر ہو گیا ہو لیکن ہسپتال والوں نے اس کا کوئی ایم آر آئی اسکین نہیں کیا۔ ہسپتال کا کہنا ہے کہ جب بچی کو ہسپتال میں داخل کیا گیا تو ڈینگی کا مرض بہت بڑھ چکا تھا اور وہ ڈینگی شاک سینڈروم کے درجے میں داخل ہوچکی تھی۔ ہسپتال کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے بچی کے والدین کو اس کی نازک صورت حال کے بارے میں باخبر رکھا تھا۔

حساب کا پرچہ جس نے سب کو رُلا دیا


(b) In a children's playground there is a rope hanging from two points, A and B, on a horizontal beam.
A and B are 6 metres apart.
The lowest point of the rope is 1 m above the ground.
The shape of the rope can be modelled by

$$y = \frac{x}{3}(x-p)+4$$

where y is the height above the ground, and x is the distance from A.

(i) How high above the ground is A?

(ii) Give the value of p.

نیوزی لینڈ میں بچوں کے سیکنڈری اسکول کے ریاضی کے پرچے میں بچوں کو ایک ایسا سوال حل کرنے کو کہا گیا جس نے انھیں رُلا دیا اور بات اتنی پھیل گئی ہے کہ اب ملک کے وزیر تعلیم نے اس معاملے کی تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ روزنامہ نیوزی لینڈ ہیرالڈ کے مطابق نیوزی لینڈ میں سیکنڈری اسکول کی سند کے لیے جاری امتحانات میں ریاضی کا ایک امتحان ہوا لیکن اکثر امتحانی مراکز سے نکلنے والے بچوں نے شکایت کی کہ پرچے کے کچھ حصے وہ ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ بچوں کا کہنا تھا کہ اب تک ریاضی کے تمن پرچے ہوچکے ہیں اور تینوں میں ایسے سوال تھے جن کو حل کرنا ناممکن تھا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ ایک طالبعلم کو شکایت ہے کہ نہ صرف پرچے کے کچھ حصے "سمجھ سے باہر" تھے بلکہ کچھ ایسے تھے جن میں معلومات اتنی کم تھیں کہ آپ ان سوالوں کو حل ہی نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ سوال ایسے بھی تھے جو نصاب سے باہر تھے۔

ایک سوال جس پر سب سے زیادہ لے دے ہو رہی ہے اس کا تعلق ریاضی کی دو درجی مساوات یا کوادریٹک ایکویشن سے تھا۔ جو کہ آپ کو سیکنڈری کی درجہ دہم تک پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ اب تک ملک بھر سے ریاضی کے 22 سالہ نے وزارت تعلیم اور امتحان لینے والے ادارے کو ایک خط لکھ کر شکایت کی ہے کہ بچوں کو ناممکن سوال حل کرنے کو دیے گئے۔ ان میں سے ایک استاد کا کہنا تھا کہ "قومی سطح کے ایک امتحان میں آپ توقع کرتے ہیں کہ سوالوں کا معیار بہتر ہوگا۔" نیوزی لینڈ میں یہ پہلا موقع نہیں کہ وزیر تعلیم کو کسی امتحان کے معاملے میں مداخلت کرکے تفتیش کا حکم دینا پڑا ہے۔ پچھلے سال بھی لوگوں نے شکایت کی تھی کہ ریاضی درجہ اوّل کا پرچہ بہت مشکل تھا جبکہ درجہ سوئم کے پرچے میں ایک ایسی غلطی تھی جس کی وجہ سے سوال حل کرنا ناممکن تھا۔ تاہم امتحان لینے والے ادارے نیوزی لینڈ کوالیفکیشن اتھارٹی کا کہنا ہے کہ وہ امتحانات کے معیار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ادارے کے سربراہ کرسٹین کے کیلیکی کا کہنا تھا کہ امتحانات میں کچھ سوال ایسے ہوں گے جو طالبعلموں کو زیادہ مشکل لگیں گے خاص طور پر وہ سوال جو اعلیٰ تعلیمی معیار کے حامل بچوں کے لیے ہوں گے۔ لیکن والدین ادارے کی اس توجیح سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ اس سے خوش نہیں ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ میں آکلینڈ کے علاقے کے بہت سے سکولوں کے بچوں کو جانتا ہوں۔ اور ملک کے دیگر علاقوں میں بھی ریاضی کے امتحان کے بعد بچوں کے اعتماد کو دھچکا پہنچا ہے اور وہ ٹوٹ گئے ہیں۔ کیا آپ بھی اس قسم کا سوال حل کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو ریاضی کے پرچے کا یہ ایک اور سوال حاضر ہے۔

بقیہ:

رام بی جے پی کا بیڑہ پار لگا سکیں گے؟

نہ تو مسلمان اور نہ ہی ہندو فریقین نے اس حوالے سے شری شری روی شنکر سے ملنے میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھگوان رام بھی بی جے پی کا بیڑا پار کرانے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ اب چناؤ جیتنے کی ساری ذمہ داری نریندر مودی پر ہے۔ مودی ایک چالاک رہنما ہیں اور کب کس کارڈ کو کھیلنا ہے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب نہ تو کوئی گودھرا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اکشر دھام جس کے دم پر وہ ہندو محافظ کے طور پر سامنے آ سکیں۔ اور اگر ایسا کچھ نہیں ہوتا تو پھر اتر پردیش کے بلدیاتی اور گجرات اسمبلی انتخابات کے نتائج بہار جیسے ہوں گے۔ ایک بار پھر وہی کبیر کا دوہا یاد آتا ہے۔ دکھ میں سمرن سب کریں، سکھ میں کرے نہ کوئے، جو سکھ میں سمرن کریں دکھ کاہے کو ہوئے۔

رام جنم بھومی-بابری مسجد تنازع

شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ قرون وسطی کے مسلمان حکمرانوں کی افتاد طبع اور مزاجوں میں بڑا تنوع تھا۔ مثلاً التمش اور محمد جوا کبر اور سرد مہر اور متعصب اورنگ زیب ہیں۔ حکمران میں سے فقط بابر ہی ہے جس کی شہرت مذہبی جوش و جذبے اور بت شکنی کی بنیاد پر مبنی نہیں تھی۔ وہ ایک خوش باش شخص تھا اور زندگی کی خوبصورت چیزوں کا بڑا شوقین تھا جیسے موسیقی، پھول، خواتین اور مزید برآں جام شراب۔ مندر گرانے اور مسجدیں بنانے کا اسے کوئی زاہدانہ شوق نہیں تھا۔ حقیقت میں ستمبر 1529ء میں گوالیار کے اپنے دورے کے دوران اس نے کچھ شہوانی مجسموں کو گرانے کا حکم دیا تھا کیونکہ انہیں دیکھ کر اسے بڑی وحشت ہوئی تھی۔ مگر اس نے شہر کے کئی "بت کدوں" کا دورہ بھی کیا تھا اور ان عمارات کو دیکھ کر اسے بہت مسرت ہوئی تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ بابر جہاں کہیں بھی گیا اس نے باغات تعمیر کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور ان کا تذکرہ کرنے میں بھی اس نے کبھی غفلت نہیں کی مگر ایودھیا کی مسجد تو ایک طرف اس نے کسی مذہبی عمارت کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

تاہم اگر ہم مسز بیورج کی منطق پر چلیں کہ مسلمان ہونے سے اس کی مراد دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا تھا تو اسے صورت میں یہ توقع رکھنی چاہئے کہ بابر رام مندر کے گرانے کا جس کی قدامت اور تقدس کا وہ اعتراف کرتی ہیں، اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کرنے کا اعلان وہ بڑے فخر سے کرتا۔ اورنگ زیب واقعی اس مزاج کا آدمی تھا جس سے وہ دوسرے مسلم حکمرانوں کو متصف کرتی ہیں۔ اورنگ زیب نے مندر گرائے، ان کی جگہ مسجدیں بنوائیں اور کسی کے لیے وہ شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ وہ انہیں اپنے کارہائے نمایاں شمار کرتا تھا۔

یہ استدلال معقول ہے کہ 1922ء کی دستاویز میں رام مندر کے ذکر کا بھی ایک پس منظر ہوگا یعنی اس روایت کے بننے اور اس کے مقبول ہونے میں بھی وقت لگا ہوگا۔ اس علاقے میں واقعی یہ بڑی مضبوط روایت ہے کہ بابری مسجد رام کی جائے پیدائش پر واقع ہے اور اس نے رام سے منسوب مندر کی جگہ لے لی اور دوسری دستاویز سے مختلف نوعیت کی شہادت کے طور پر مورخوں کو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ لیکن اول تو کوئی مقبول روایت جو عوام کی ذہنیتوں کی عکاس ہوتی ہے اور کلچرل مظہر جس نے ایک لمبے عرصے میں ارتقا کی منزلیں طے کی ہوں گو مورخوں کی توجہ کا مستحق ہو سکتے ہیں مگر کسی واقعہ کی شہادت بننے کے لیے یہ لازمی ہے کہ انہیں تاریخ کے کڑے معیاروں پر بڑی شدت سے پرکھا جائے رام مندر کے انہدام اور اس کی جگہ پر 1528ء میں مسجد کی تعمیر کرنے کی شہادت کے طور پر عوام میں مقبول روایت پر اصرار کرنا تاریخ میں روایت کی نوعیت کی غلط تعبیر ہے کیونکہ ان دونوں (یعنی مسجد کی تعمیر اور روایت کے ابھرنے) کے درمیان وقت کا بڑا فرق ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں سترہویں اور اٹھارویں صدی کے بڑے حصے میں ایسے کسی عقیدے کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے۔ 1822ء کی دستاویز صرف یہ ظاہر کرتی ہے رام جنم بھومی پر مسجد تعمیر کرنے کی روایت کا آغاز شاید اٹھارویں صدی میں ہوا اور انیسویں صدی کے دوران اس مقام کو مندر سے منسوب کر دیا گیا۔ مذہبی عقائد کے علاوہ سماجی، سیاسی اور نفسیاتی ماحول میں اس روایت کا ارتقا بڑا دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے لیکن دو یا تین صدیاں پیشتر پیش آنے والے کسی مخصوص واقعہ کے لیے یہ روایت کسی صورت میں بھی ایک ناقابل اعتراض شہادت نہیں بن سکتی۔

مسجد میں نصب کالے پتھر کے ستونوں پر بحث ابھی باقی ہے۔ پی کارنیگی نے یہ ستون 1870ء میں دیکھے اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں انھوں نے ان ستونوں کی بنا پر قیاس دوڑایا۔ اگر کارنیگی کو یہ یقین نہیں تھا کہ یہ بدھوں کا مندر یا رام مندر ہے تو ڈاکٹر ایس پی گپتا کے دل میں ایسا کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھیں پورا یقین تھا کہ یہ ستون مندر کے ہی ہیں جو اپنی اصلی حالت میں وہاں موجود ہیں لیکن یہ نتیجہ قدرے مشکوک ہے کیونکہ عمارت کے جو صحن کے اطراف ہے داخلی دروازے پر جو دو ستون نصب ہیں ان پر کندہ کاری میں اختلاف ہے۔ حقیقت میں اس دیوار میں چودہ ستون موجود ہیں۔ ان میں سے دس ستونوں پر کندہ کاریاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کے نصب کرنے میں بھی کوئی ترتیب نہیں۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اپنی اصلی حالت میں نہیں ہیں۔ یہ ستون خواہ وہ کسی مندر ہی کی کیوں نہ ہوں، کسی دوسری قریبی جگہ سے لائے گئے ہیں گو اس امر کے لیے بھی کوئی فیصلہ کن شہادت موجود نہیں۔ کسی نہ کسی طرح گپتا کے تیقن میں کچھ اضافہ ہو جاتا اگر وہ پتھر کے ستونوں کے مواد کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیتے۔ 2/دسمبر 1990ء کو انھوں نے بڑے وثوق سے اعلان کیا کہ "یہ پتھر کالی سلیٹ کے پتھروں کی ایک قسم ہے اور جہاں تک یوپی کا تعلق ہے یہ صرف گھڑوال اور کماؤں کے اضلاع میں ملتا ہے۔" لیکن پندرہ دن کے اندر ہی یعنی 13دسمبر کو اپنے تیقن میں کسی کمی کے بغیر انھوں نے پھر اعلان کیا کہ "یہ بسالٹ ایک آتشیں چٹان ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے سے بنتی ہے لیکن وہ ایسی چٹانیں جن سے یہ ستون بنائے گئے ہیں رسوبی چٹانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو سمندروں کی تہہ میں ملتی ہے۔"

(مضمون نگار معروف مورخ ہیں۔ بشکریہ: عہد وسطی کا ہندوستان، ہرنس مکھیا، فکشن ہاؤس لاہور، 2003)

دی وائر اردو سے مستعار

امریکہ میں خوف کی صنعت...

درحقیقت اب امریکا کی بارڈر سکیورٹی اسرائیلی کمپنیوں کے لیے آمدن کا ایک بڑا ذریعہ بن چکی ہے۔ ان فراخ دلانہ منفعت بخش ٹھیکوں میں سے ایک وہ تھا جو اوباما انتظامیہ نے اسرائیلی کمپنی ایلبٹ سسٹم کو دیا تھا۔ اس کی مالیت ساڑھے چودہ کروڑ ڈالرز تھی۔ اس کمپنی نے ایریزونا/سونورا امریکا، میکسیکو بارڈر کے ساتھ ٹاورز تعمیر کیے تھے اور نگرانی کے آلات مہیا کیے تھے۔ ایلبٹ نے مبینہ طور پر طیارہ ساز کمپنی بوئنگ سے 2006ء میں "ڈی ایچ ایس" تزویراتی بارڈر اقدام کے تحت بھی رقم اینٹھی تھی۔

غزہ کی پٹی پر اسرائیلی فوج کے محاصرے کو مضبوط بنانے میں مدد دینے والی اسرائیلی فرم مگال سکیورٹی سسٹم امریکا کی سکیورٹی صنعت میں بھرپور طریقے سے فعال ہے۔ بیان کمپنیوں میں سے ایک ہے جو امریکا کو میکسیکو سے الگ تھلگ کرنے کے لیے دیوار کی تعمیر کر رہی ہیں۔

اسرائیل کے غیر قانونی حربے اب امریکا کے لیے ایک نمونہ قرار پائے ہیں اور ان کے ذریعے اب امریکی شہروں میں پولیس نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ اس کی سرحدوں کی نگرانی کی جا رہی ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کے بھی اصول و ضوابط وضع کیے جا رہے ہیں۔

لیکن یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسرائیلی دیواریں دفاع کے لیے نہیں ہیں بلکہ فلسطینی اور عرب سرزمین کو ہتھیانے اور اس کو ضم کرنے کے لیے ہیں جبکہ اسرائیل ''خطرات'' کے ایک قومی فوبیا کو ہر کہیں پھیلا رہا ہے۔

دوسری جانب نائن الیون حملوں کے بعد امریکا کے غیر ذمے دارانہ اور متشدد ردعمل نے امریکی خوف و خدشات کو دنیا میں ہر کہیں پھیلا دیا ہے لیکن اب ڈونلڈ ٹرمپ کی تباہ کن پالیسیوں نے اسرائیل کی امریکی حکومت اور معاشرے میں دراندازی کے لیے حقیقی معنوں میں راہ ہموار کر دی ہے۔

اس بات کا ثبوت امریکا کے تمام بڑے شہروں، مختلف سرحدوں اور نگرانی کے نظام میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس نظام میں ہر امریکی شہری کی نگرانی کی صلاحیت ہے۔

...بھرشٹا چار مکت ہو جائیے

اور بی جے پی انھیں بھرشٹ بتانے میں تھک نہیں رہی تھی۔ انھیں بھی سلاخوں کا خوف دلا کر بھاجپا کے مرکزی وزیر قانون نے قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ایک جلسہ میں بھاجپا میں شامل کر کمل کا پھول پیش کیا گیا۔ مکل رائے بھی بھاجپا حکومت کے اس احسان تلے اس قدر دب گئے کہ جس ترنمول کانگریس کو بڑی محنت سے ایک بڑی اور اہم پارٹی بنائی، اسی پارٹی اور ممتا بنرجی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے نریندر مودی جی کی رہنمائی میں کام کرنے کا عہد کیا ہے۔ مہاراشٹر میں آدرش گھوٹالے کے معاملے میں بری طرح پھنسے نارائن رانے کو بھی بی جے پی نے ڈرا دھمکا کر اور کرپشن کے کیچڑ سے نکال کر بھاجپا باتھ ٹب میں غسل کرا کر کرپشن مکت کر اپنی پارٹی میں شامل ہی نہیں کیا ہے، بلکہ انھیں وزیر بھی بنانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے۔ تمل ناڈو میں اپنی زمین تلاش رہی بی جے پی نے کروناندھی کو بھی اپنے دام میں لانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ کروناندھی کے خاندان کے بیشتر افراد ٹو جی اسپیکٹرم گھوٹالے میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں اور کئی تو اس سلسلے میں جیل یاترا بھی کر چکے ہیں۔ ابھی چند روز قبل نریندر مودی مدراس دورے پر گئے تو وہ خاص طور پر ڈی ایم کے پارٹی کے سربراہ کروناندھی سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ باتیں کیا ہوئیں یہ ابھی طشت از بام نہیں ہوئی ہے لیکن کچھ نہ کچھ جلد سامنے آنے کی توقع ہے۔

ادھر سپریم کورٹ نے گزشتہ روز اپنے ایک عبوری حکم میں مرکزی حکومت سے ممبران پارلیامنٹ اور ممبران اسمبلی کے خلاف زیر التوا مقدمات کو جلد حل کرنے کے لئے اقدامات کیے جانے کا حکم صادر کیا ہے۔ زیر التوا معاملے میں جہاں عاپ کے 26، کانگریس کے 248 وہیں بی جے پی کے 523 ممبران کے خلاف مقدمات درج ہیں۔

اب یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو بھاجپا کرپشن کو نظر انداز کرتے ہوئے بقول کانگریس کے نائب صدر راہل گاندھی کہ جن کرپٹ لوگوں کو کانگریس نے کوڑے میں پھینک دیا تھا، انھیں مودی ٹکٹ دے رہے ہیں۔ اسلئے مودی جی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بدعنوانیوں پر باتیں کریں۔ اس لئے کہ جتنے بھی کرپٹ لوگ میرے ساتھ تھے وہ سب کے سب اب بھاجپا میں شامل ہو گئے ہیں۔ ایسے میں وہ سپریم کورٹ کے اس عبوری حکم پر کیا کرتے ہیں اس کا انتظار سبھوں کو ہے۔

انور جمال انور

تو انھیں 'راج بھاشا' کی نشر و اشاعت کی اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ یہ کام انھوں نے کس طرح انجام دیا یہ تو انھوں نے نہیں بتایا لیکن ان کی بعض نظموں (اور کچھ غزلوں) میں ایسے اشعار ضرور ہیں جن میں 'لوک بھاشا' کے بجائے 'راج بھاشا' کے ثقیل، اور کم از کم اردو والوں کے لیے کسی قدر نامانوس الفاظ بلا ضرورت در آئے ہیں جن کی جگہ نہایت آسانی سے غالب کی 'سبک ہندی' اور آرزو لکھنوی کی 'سریلی بانسری' والے آسان اور عام فہم ہندی الفاظ بھی لائے جا سکتے تھے۔ مجموعی طور پر حبیب معظم انور جمال انور ایک سچے اور معتدل مزاج انسان ہیں اور ان کی شاعری ان کی اعتدال پسند شخصیت کا پرتو ہے۔

عظیم افسانہ نگار اور چالیس سال سے بلاناغہ شائع ہونے والے 'اپنی نوعیت کے اکلوتے ادبی جریدے 'گلبن' کے مدیر شہیر سید ظفر ہاشمی نے، اپنے بارے میں مدیر 'اردو بک ریویو' عارف اقبال کے ایک سوال کے جواب میں جو بات کہی ہے وہی انور صاحب پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے کہ "ان کی زندگی صاف ستھری میدانی ندیا میں تیرتی ہوئی ایک چھوٹی سی کشتی کے مانند ہے، جو سرد و گرم زمانہ سے بے نیاز ٹھنڈی پروائیا کے سہارے چلی جا رہی ہے"!

انور صاحب کے مزاج کی نرمی اور کردار کی سچائی ان کی سیدھی سادی شاعری میں صاف جھلکتی ہے۔ ہم ان کی صحت اور طول عمری کے لیے دست بدعا ہیں۔ آپ بھی آمین کہیں۔

کتاب "پرواز حیات" کے ناشر تو انور صاحب خود ہیں لیکن طباعت اور بائنڈنگ وغیرہ کی ذمہ داریاں نعمانی پرنٹنگ پریس گولہ گنج لکھنؤ کے عزیزم اویس سنبھلی نے بہ حسن و خوبی نبھائی ہیں۔ کتاب دانش محل امین آباد لکھنؤ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، اردو بازار، جامع مسجد دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو کتابوں اور بالخصوص شعری مجموعوں کی روایت کے برخلاف 'پرواز حیات' کے لیے ISBN No بھی حاصل کرایا گیا ہے!

البیرونی اور جغرافیہ

البیرونی نے اس کتاب میں دواؤں کے عربی نام کے ساتھ تقریباً 900 جڑی بوٹیوں کے فارسی نام، 700 دواؤں کے یونانی نام، 400 دواؤں کے سریانی نام اور 350 کے ہندی نام کو بیان کیا ہے۔ آپ نے بایولوجی میں ارسطو کے کاموں، دیوسکوریدس اور جالینوس کی تحریروں اور پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے جڑی بوٹیوں کے ماہرین کے حوالے سے دلیل اور معلومات پیش کی ہے۔

البیرونی خود کئی زبانوں کے ماہر تھے، چنانچہ انہیں جڑی بوٹیوں کے نام کو سمجھنے اور انہیں مختلف زبانوں میں بیان کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

نہایت باریکی اور چھان پھٹک کر آپ نے مختلف زبانوں میں ان دواؤں کے ناموں کو بیان کیا آپ نے عربی زبان میں فارسی کی اصطلاحات کو متحد کرنے کی کوشش کی۔

آپ سعد پودے کے بارے میں کہتے ہیں:

سعد بالرومیہ فرنارس، وبالسریانیہ سعدی، وبالہندیہ مت وبالزابلیہ مست، وبالعجریہ خویہ، وبالترکیہ طبراق۔

سعد کو رومی زبان میں فرنارس، سریانی میں سعدی، ہندی میں مت، ہجری میں خویہ اور ترکی میں طبراق کہتے ہیں۔ فارسی میں آپ نے دنیا کو ایک نہایت اہم اور قیمتی تحفہ پیش کیا ہے، آپ کے ذریعہ پیش کی گئی معلومات آج تک قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور اطبا و ماہرین ادویات سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اسسٹنٹ پروفیسر، امام محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض

سیکولرازم اور مقبول

تین سال قبل گودھرا کے ہیبت ناک واقعہ کے بعد اور گجرات میں بے رحمانہ انتقامی قتل عام اور آتش زنی کے نتیجے میں جس میں صوبائی حکومت نے بھی بے عملی کے ذریعہ مدد پہونچائی تھی، ہندوستان ایک انتہائی نازک موڑ پر پہونچ گیا تھا۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کیا ہندوستانی سیکولرازم ملک کو ایک ساتھ قائم رکھے گا یا ہندوتوا کے نظریے کے آگے ہتھیار ڈال دے گا جو خطرناک حد تک مملکت کی تقسیم کا باعث بنے گا؟ میرے نزدیک گزشتہ سال یو۔پی۔اے اتحاد کے اقتدار میں آنے کے نتیجے میں تصویر کا رخ کئی حیثیتوں سے تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے قبل کہ اپنی بات ختم کروں، میں آپ کے سامنے ہارورڈ لاء اسکول کے پروفیسر Lani Guinier کی ایک عبارت نقل کرنا چاہتا ہوں: "سماج کی صحت کی جانچنے کا سب سے بہترین پیمانہ یہ ہے کہ اس کی اقلیتوں کی حالت پر نظر ڈالی جائے۔ اقلیتیں کوئلہ کان کنوں کے بلبل زرد (Canary کی مانند ہیں۔ کوئلے کی کان میں زہریلی گیس کی اطلاع سب سے پہلے کینری پرندے کو ہی ہوتی ہے۔ اگر (سماج میں) اقلیتوں کی حالت غیر مامون ہے تو اجتماعی معاشرہ کو صحت مند نہیں تصور کیا جا سکتا۔" مقبول سنیما میں اقلیتوں کی تصویر کشی سنیما کے تئیں عوامی رویے کا ایک اچھا پیمانہ ہے۔ اسے بآسانی ہندوستانی سماج میں کوئلہ کان کنوں کا وہ پرندہ تصور کیا جا سکتا ہے جس کو سب سے پہلے زہریلی گیس کی خبر ملتی ہے۔

(مضمون نگار معروف اور سینئر فلم ڈائرکٹر ہیں)

RNINo.UPURD/ 2012/45277
پروپرائٹر ایس ایم زین الحق شمسی کے لیے
پبلشر اور پرنٹر
ایس ایم زین الحق شمسی
نے ویبھا پبلی کیشن پرائیویٹ لمیٹڈ
ڈی-160 بی فیس-1 نوئیڈا
سے چھپوا کر لکھنؤ آفس سی-48/28
وارڈ رام تیرتھ نرہی لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر
ایس ایم زین الحق شمسی
دہلی آفس
ای-217 گراؤنڈ فلور، شاہین باغ
جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی-110 025
فون: 8287289231,9958227158
muslimduniyadel@gmail.com
duniyamuslim@gmail.com
Website:muslimsduniya.com
Published from 48/28 Ward Ram, Tirath Narhi Lucknow



خواتین کی پہلی آل انڈیا سیاسی جماعت پر ایک نظر

- ڈاکٹر نوہیرا نے 19 سال کی عمر میں آندھرا پردیش کے مندروں کے شہر تروپتی میں لڑکیوں کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد قرآنی ہدایات کے تحت زندگی گذارنے کے طریقے سکھانا ہے۔
- ڈاکٹر نوہیرا جو کہ ایک عالمہ بھی ہیں، پابند شرع ہیں اور خالص اسلامی اصولوں پر تجارت کرتی ہیں۔ ان کی تجارت سود سے پاک ہے۔ ملک و بیرون ملک کے بہت سے لوگوں نے ان کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔
- ڈاکٹر نوہیرا نفع نقصان کی بنیاد پر سرمایہ کاروں کو ان کا حصہ دیتی ہیں۔ انھیں تجارت کے میدان میں متعدد ملکی و عالمی ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں۔
- 1998 سے ہی خواتین کی فلاح و بہبود کے شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔
- 12 نومبر کو دہلی کے للت پیلیس میں انھوں نے اپنی آل انڈیا سیاسی پارٹی کا افتتاح کیا۔
- اس موقع پر مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں خدمات انجام دینے والی پچیس تیس خواتین کو اعزاز سے نوازا گیا۔ ان میں سے بہت سی خواتین اب بھی سماجی فلاح و بہبود کے شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔
- ڈاکٹر نوہیرا شیخ نے اپنی پارٹی کے اغراض و مقاصد ملک کے عوام تک پہنچانے کے لیے دعویٰ کیا کہ اب تک ملک کی تمام ریاستوں سے 16 لاکھ افراد ان کی پارٹی کے ممبر بن چکے ہیں جن میں 80 فیصد خواتین ہیں۔

سہیل انجم

ہندوستان میں خواتین کی تعداد 64 کروڑ ہے۔ ان کے بے شمار مسائل ہیں۔ ان کے ساتھ جگہ جگہ ناانصافی ہوتی ہے۔ حکومتیں ان کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں تو بناتی ہیں مگر ان تک اسکیموں کا فائدہ نہیں پہنچتا۔ ان کے خلاف بڑے پیمانے پر جرائم ہوتے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو سزا ہو پاتی ہے۔ کیا خواتین کو بااختیار نہیں بنانا چاہیے، کیا ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہونی چاہیے؟ ضرور ہونی چاہیے۔ اور اسی مقصد کے تحت ہم نے عورتوں کی سیاسی جماعت آل انڈیا مہیلا ایمپاورمنٹ پارٹی کا قیام کیا ہے"۔ یہ کہنا ہے ڈاکٹر نوہیرا شیخ کا۔ وہ ہندوستان میں قائم ہونے والی خواتین کی پہلی سیاسی جماعت "آل انڈیا مہیلا ایمپاورمنٹ" کی صدر ہیں۔ آئیے پہلے ڈاکٹر نوہیرا شیخ کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔ وہ ملک کی مغربی ریاست آندھرا پردیش کے حیدرآباد میں سرگرم ہیں۔ وہ ہیرا گروپ آف کمپنیز کی سی ای او ہیں۔ یہ گروپ آندھرا پردیش میں دو تعلیمی اداروں اور 20 تجارتی کمپنیوں پر مشتمل ہے اور سونا، سرمایہ کاری، ٹیکسٹائل، زیورات، منرل واٹر، گرینائٹ، ٹورس اینڈ ٹریولس، ریئل اسٹیٹ، الیکٹرانکس اور حج و عمرہ سروسز جیسے شعبوں میں سرگرم ہے۔ وہ ہندوستان کے علاوہ متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، چین، کینیڈا اور گھانا سمیت متعدد ملکوں میں بزنس چلا رہا ہے جو کہ غیر سودی نظام پر مبنی ہے اور اس کا تمام کاروبار شرعی نظام کے تحت چلتا ہے۔ ڈاکٹر نوہیرا نے 19 سال کی عمر میں آندھرا پردیش کے مندروں کے شہر تروپتی میں لڑکیوں کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد قرآنی ہدایات کے تحت زندگی گذارنے کے طریقے سکھانا ہے۔ یہ ادارہ اب کافی ترقی کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تعلیمی ادارہ قائم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نوہیرا جو کہ ایک عالمہ بھی ہیں، پابند شرع ہیں اور خالص اسلامی اصولوں پر تجارت کرتی ہیں۔ ان کی تجارت سود سے پاک ہے۔ ملک و بیرون ملک کے بہت سے لوگوں نے ان کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔ ڈاکٹر نوہیرا نفع نقصان کی بنیاد پر سرمایہ کاروں کو ان کا حصہ دیتی ہیں۔ انھیں تجارت کے میدان میں متعدد ملکی و عالمی ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں۔

وہ 1998 سے ہی خواتین کی فلاح و بہبود کے شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ 12 نومبر کو دہلی کے للت پیلیس میں انھوں نے اپنی آل انڈیا سیاسی پارٹی کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں خدمات انجام دینے والی پچیس تیس خواتین کو اعزاز سے نوازا گیا۔ ان میں سے بہت سی خواتین اب بھی سماجی فلاح و بہبود کے شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر نوہیرا شیخ نے اپنی پارٹی کے اغراض و مقاصد ملک کے عوام تک پہنچانے کے لیے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس بھی کی۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ اب تک ملک کی تمام ریاستوں سے 16 لاکھ افراد ان کی پارٹی کے ممبر بن چکے ہیں جن میں 80 فیصد خواتین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی پارٹی کسی ایک مذہب کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پارٹی کے ممبران میں 30 فیصد غیر مسلم خواتین بھی ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگرچہ یہ خواتین کی سیاسی جماعت ہے لیکن اس میں باکردار مردوں کے لیے بھی جگہ ہے۔ البتہ ان کی شرح صرف 20 فیصد ہوگی۔ ان کی پارٹی قانون ساز اداروں میں خواتین کے لیے 33 فیصد نشستیں مخصوص کرانے کے بل کو جو کہ پارلیمنٹ میں اٹھارہ برسوں سے معلق ہے، منظور کرانے کی کوشش کریں گی اور آگے چل کر اس کی کوشش خواتین کو پچاس فیصد ریزرویشن دلانے کی ہوگی۔ انھوں نے ان طاقتوں پر شدید حملہ کیا جو فرقہ واریت کی سیاست کرتی ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ہوں۔ ڈاکٹر نوہیرا نے اس نمائندے سے بات چیت میں کہا کہ وہ ملک کی تمام عورتوں کی فلاح و بہبود چاہتی ہیں۔ وہ نہ صرف ان کے مسائل کی نشاندہی کریں گی بلکہ ان کو حل کرنے کے فارمولے بتائیں گی اور انھیں حل بھی کروائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا تعلق کبھی بھی کسی سیاسی جماعت سے نہیں رہا ہے۔ وہ نہ تو کسی پارٹی کی ممبر ہیں، نہ ہی ایم پی یا ایم ایل اے ہیں۔ وہ خواتین کے ساتھ ہندوستان کی مین اسٹریم کی سیاسی جماعتوں کے رویے سے بہت شاکی ہیں۔ انھیں بہت افسوس ہوتا ہے کہ یہ پارٹیاں خواتین کے مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اسی لیے مجبور ہو کر ان کو سیاست کے میدان میں قدم رکھنا پڑا۔

ڈاکٹر نوہیرا نے جدہ میں مقیم ایک این آر آئی محمد عاقل کو دہلی شاخ کا صدر مقرر کیا ہے۔ محمد عاقل نے بھی خواتین کے مسائل کے سلسلے میں سیاست دانوں کے رویے پر اظہار افسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس پارٹی کا مقصد خواتین کے ہر قسم کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جس میں صنفی مساوات ہو۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا اور کہا کہ اگر ایک خاتون تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ ہر اعتبار سے مضبوط ہوگی۔ اور جب وہ مضبوط ہوگی تو پورا خاندان مضبوط ہوگا اور اسی طرح پوری کمیونٹی مضبوط ہوگی۔ جب تک خواتین مضبوط نہیں ہوں گی اس وقت تک ہندوستان میں ایک مثالی معاشرہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کے 16 لاکھ ممبر بن چکے ہیں تو کیا اس میں بڑی خاتون شخصیات بھی شامل ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہمارا نظریہ بڑا ہے، ہمارا مشن اور ویژن بڑا ہے اور جب ویژن بڑا ہوتا ہے تو لوگ خود بہ خود بڑے ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا واقعی یہ خواتین کی پہلی سیاسی جماعت ہے کیونکہ دسمبر 2016 میں بھی دہلی میں خواتین کی ایک سیاسی جماعت قائم کی گئی تھی جس کا نام تھا "آل انڈیا ویمن یونائیٹڈ پارٹی"۔ اس نے بھی خواتین کے حقوق کے تحفظ کو اپنا ایجنڈا قرار دیا تھا۔ اس کی صدر نسیم بانو خان کو بنایا گیا تھا جو کہ تیس برسوں سے سماجی خدمات کے شعبے میں سرگرم ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس پارٹی کا نام نہیں سنا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی سرگرمی کہیں نظر آئی۔ اس نے اپنے ممبران کی تعداد بھی نہیں بتائی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اب بھی کام کر رہی ہو لیکن اس کی سرگرمیاں میڈیا میں نظر نہیں آتیں۔ آل انڈیا مہیلا ایمپاورمنٹ پارٹی کے ذمہ داروں کا یہ تو دعویٰ ہے کہ اب تک اس کے 16 لاکھ ممبر بن چکے ہیں لیکن انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ خواتین کی پہلی سیاسی جماعت ہے۔ لیکن انھوں نے جن عزائم کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پارٹی آگے جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر نوہیرا شیخ نے بتایا کہ ان کی پارٹی ملک کی تمام 29 ریاستوں میں سرگرم رہے گی اور وہ اپنی انتخابی سیاست کا آغاز کرناٹک میں آئندہ ہونے والے اسمبلی انتخابات میں حصہ لے کر کرنے جا رہی ہے۔

نوہیرا شیخ اور ان کے رفقا کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ سیاست کی وادی بڑی پر خار ہے۔ یہاں قدم قدم پر کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے اور تلووں کو لہولہان کرنا پڑتا ہے۔ سیاست بہت بے رحم بھی ہوتی ہے۔ اس میدان میں بڑے بڑوں کی دستاریں اچھلتی ہیں اور شرفا کی تو عزت اچھالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نوہیرا کی یہ بات درست ہے کہ اگر یہ سوچ کر کہ سیاست میں گندے لوگ بہت آ گئے ہیں لہٰذا اس سے دور رہا جائے، مناسب نہیں ہے۔ اگر اچھے لوگ سیاست میں نہیں آئیں گے تو اسے صاف کیسے کیا جا سکے گا۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ لوگ الیکشن جیتنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے اختیار نہیں کرتے۔ کیا کیا سازشیں نہیں کی جاتیں۔ کیسی کیسی عیاریاں اور مکاریاں نہیں کی جاتیں۔ یہاں تک کہ مخالفین کی کردار کشی تک کی جاتی ہے۔ اصلی نقلی سیکس سی ڈی جاری کرکے دنیا بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرضی اسٹنگ آپریشنوں کی مدد سے رسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یقیناً ان باتوں پر پارٹی کے ذمہ داروں کی نظر ہوگی۔ ڈاکٹر نوہیرا ایک تو خاتون ہیں، دوسرے مسلمان ہیں اور تیسرے پابند شرع ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے خطرات کہیں زیادہ ہیں۔ انھیں بہت بچ بچ کر چلنا ہوگا۔ انھیں غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی سازشوں کا بھی سامنا ہوگا۔ لوگ مسلکی و مذہبی تنازعات میں بھی الجھانے کی کوشش کریں گے۔ انھیں ایسے تنازعات سے بہر حال بچنا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر نوہیرا کا یہ قدم قابل ستائش ہے۔ کیونکہ بہر حال اگر خواتین بااختیار ہوں گی تو وہ پورے معاشرے کو سدھار سکتی ہیں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں اور بے خطر نہیں۔

sanjumdelhi@gmail.com

گمراہ کن نظریات اور فکری تاریکیوں کے خلاف ایک **نئی جنگ**

خموشی کے عہد میں احتجاج کی ایک ایسی آواز جو **بدل دے گی آپکے ذہن کی پوری کائنات**

مایوسیوں، محرومیوں اور گمان کے اندھیرے میں ذوقِ یقیں کی

ایک نئی شمع



معروضی، منطقی اور منصفانہ صحافت کا آئینہ

جس کا ہر صفحہ دیگا آپ کے ذہن پر دستک

جلتا رہے گا یہ چراغ تو ہوگی ہر طرف روشنی ہی روشنی

اخبار کی کاپی حاصل کرنے کیلئے رابطہ کریں **9198624346, 9696842724**

صرف -/500 روپئے سالانہ جمع کر کے آپ کہیں بھی اپنے پتے پر اخبار کی کاپی ہر ہفتہ منگا سکتے ہیں۔

Account Name: **MUSLIM DUNIYA** Bank: **BANK OF BARODA**
A/C No.: **08700200000583** IFS Code: **BARB0NARHIX**

جمع کی گئی رقم کی رسید اور اپنا پورا پتہ وہاٹس اپ کریں **9918861888**

Zainul Haq Shamsi (Publisher, Printer & Editor): **9958227158, 9873354386**
Email: **muslimduniyadel@gmail.com** Website: **www.muslimsduniya.com**
Delhi Off.: E-215, 2nd Floor, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25